جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا مجاہد شاعر
(میر محمد اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی)
ڈاکٹر توصیف تبسم

C

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا مجاہد شاعر

(میر محمد اسمٰعیل حسینؒ منیر شکوہ آبادیؒ)

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا مجاہد شاعر

(میر محمد اسمٰعیل حسینؒ منیرؔ شکوہ آبادیؒ)
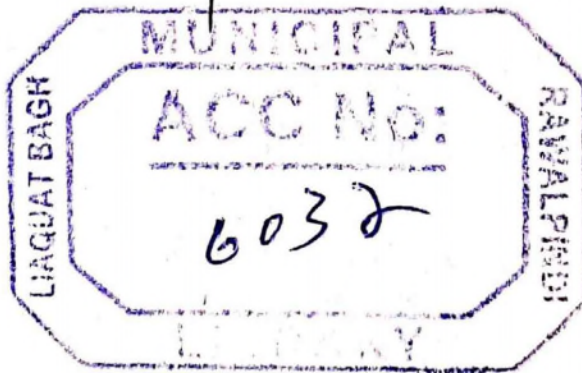
ڈاکٹر توصیف تبسم

کتاب	جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا مجاہد شاعر امیر اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی
مصنف	ڈاکٹر توصیف تبسم
NBF اشاعتِ اوّل 2006	تعداد 1000
کوڈ نمبر	جی این یو۔293
قیمت	-/130 روپے
مطبع	روحانی آرٹ پریس، اسلام آباد
ناشر	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

ISBN: 969-37-0229-8

نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد

راولپنڈی، لاہور، ملتان، فیصل آباد، واہ کینٹ، بہاولپور، کراچی
حیدر آباد، سکھر، نواب شاہ، لاڑکانہ، جیکب آباد، پشاور
ایبٹ آباد، کوہاٹ، ڈی آئی خان، بنوں، کوئٹہ

مندرجات

حوالہ جات و حواشی
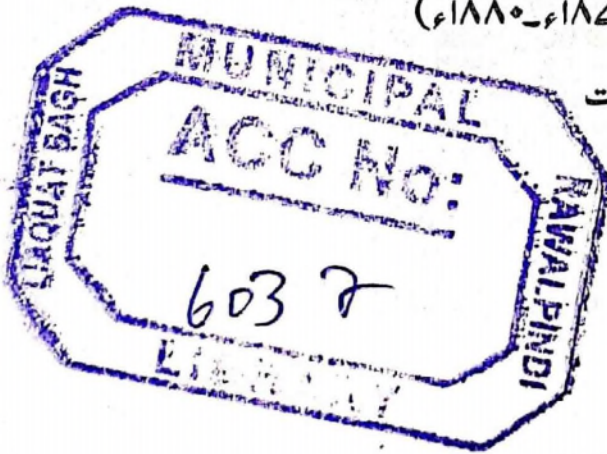
انتساب

محقق، نقاد، شاعر اور اُستاد شعبۂ اُردو

مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر اسعد بدایونی کے نام

زمیں سے خلا کی طرف جاؤں گا

وہاں سے خدا کی طرف جاؤں گا

اگر میں نہ آغاز میں مر گیا

تو پھر انتہا کی طرف جاؤں گا

(اسعدؔ)

۱۹۵۸ء - ۲۰۰۳ء

سرآغاز

میر محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی (۱۸۱۸ء-۱۸۸۰ء) کا شمار انیسویں صدی کے ان باکمال شاعروں میں ہوتا ہے جن کی قوت ایجاد و اختراع اور قدرت زبان سے انکار ممکن نہیں۔ ان کی ضخیم کلیات کم و بیش تمام اصناف سخن پر محیط ہے لیکن افسوس ہے کہ جہاں ان کے شاعرانہ مرتبہ کے تعین میں بعض اہل نقد و نظر افراط و تفریط کا شکار رہے' وہیں ان کی زندگی کے بعض اہم گوشوں کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو ان کا حق تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ منیر اپنے عہد کی پیداوار تھے جو شعری روایات ان کو ورثے میں ملی تھیں' انہوں نے ان کو اپنے شعر و ادب کے دامن میں جگہ دینے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کا ثبوت بھی دیا۔ انیسویں صدی کے آغاز ہی سے ہماری زندگی پر مغربی اثرات پڑنے شروع ہوگئے تھے لیکن منیر نے ان سے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا۔ انہوں نے ہمارے ادب میں نئی راہیں بھی نہیں کھولیں بلکہ قدیم ہی کو اس انداز سے پیش کیا کہ وہ آنے والے لوگوں کے لئے فکر انگیز اور قابل توجہ بن سکے۔ البتہ ان کی شاعری کا ایک خاص رخ جس کو "حبسیہ" کہنا مناسب ہوگا' خاص توجہ چاہتا ہے کیونکہ اس میدان میں جو ان کو اولیت حاصل ہے اس میں اور کوئی دوسرا شاعر ان کا مدمقابل نہیں ہے۔

برصغیر میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا اہم واقعہ جس وقت رونما ہوا اس وقت منیر شکوہ آبادی ریاست باندہ میں نواب علی بہادر کے ملازم تھے۔ منیر ہمارے ان شاعروں میں ہیں جو جنگ آزادی کے ہنگامہ میں نہ صرف عملی طور پر شریک رہے بلکہ اس شرکت کے جرم میں وہ گرفتار ہوئے' ان پر مقدمہ چلا اور سزا کے طور پر ان کو کالے پانی کی سزا بھگتنی پڑی۔ انڈمان میں جو پانچ برس کی مدت انہوں نے گزاری وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس دوران میں انہوں نے جو کچھ لکھا وہ معروضی حبسیہ شاعری کا اولین نمونہ ہے۔

۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی میں ناکامی کے بعد جس کو انگریز نے غدر یا بغاوت کا نام دیا' نہ

صرف یہ کہ ہر قسم کی ذہنی اور جسمانی اذیت مجاہدین کو پہنچائی گئی بلکہ ان کی کردار کشی میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔ منیر کو کالے پانی کی سزا کا سبب ایک طوائف نواب جان کے قتل کو قرار دینا، اسی کردار کشی کا حصہ تھا۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے بعض تذکرہ نگار بغیر اصل حقائق کو جانتے ہوئے، اسی رو میں بہہ گئے ہیں۔ ان کے خیال میں منیر کو یہ سزا اسی قتل کے نتیجے میں دی گئی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اصل صورت حال کو داخلی اور خارجی شہادتوں کی روشنی میں سامنے لایا جائے اور بدنامی کے اس داغ کو دھویا جائے جو اس بڑے شاعر کے دامن پر اس کے دشمنوں اور اس کے نادان دوستوں نے لگایا ہے۔ یہ مقالہ ایسی ہی ایک حقیر کوشش ہے۔ اس مقالہ میں منیر کے شاعرانہ کمالات کو تمام و کمال بیان کرنا ممکن نہیں تھا، البتہ ہم نے ان کی حبسیہ شاعری کو کسی قدر تفصیل سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس کو ان کا امتیازی وصف قرار دیا جاسکتا ہے۔

حیات

سوانح (آغاز سے ۱۸۵۷ء تک)

سید اسمٰعیل حسین نام اور منیر تخلص تھا- آپ کا وطن شکوہ آباد (۱) تھا- شکوہ آباد مین پوری ضلع کے چار بڑے قصبوں میں سے ایک ہے جو آگرہ سے جنوب مشرق کی سمت تقریباً اسی میل کے فاصلے پر واقع ہے- ۱۸۷۲ء کی مردم شماری کے مطابق شکوہ آباد کی کل آبادی ۱۰۰۶۹ نفوس پر مشتمل تھی (۲)- شکوہ آباد ایک قدیم بستی ہے جہاں کئی معزز خاندان آباد ہیں' یہیں ایک سادات گھرانے میں منیر کی پیدائش ہوئی- منیر کے والد کا نام سید احمد حسین نقوی تھا- سید احمد حسین شاعر بھی تھے' شاد اور شکر دونوں ان کے تخلص تھے (۳)-

بحیثیت شاعر' سید احمد حسین کو ادبی حلقوں میں خاص قدرومنزلت حاصل تھی- میر احمد حسین کی استعداد علمی اچھی تھی- ان کا اکثر دہلی آنا جانا رہتا تھا- یہ زمانہ میرو سودا کی شہرت کا زمانہ تھا- چنانچہ آپ بھی مرزا رفیع سودا کے تلامذہ میں شامل ہو گئے اور بہت جلد ان کے ممتاز شاگردوں میں آپ کا شمار ہونے لگا- کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کلیات بھی مرتب کی تھی لیکن شاید اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی(۴)-

منیر کے والد ایک جامع الصفات شخص تھے- نجیب الطرفین سید ہونے کے علاوہ آپ ایک قناعت پسند شخص تھے' عابد وزاہد بھی تھے- ان کا محدّث اور منشی ہونا ان کے صاحب علم ہونے کی دلیل ہے- ادبی حلقوں میں اپنی شاعری کے علاوہ' نثرنگاری اور داستان گوئی کے سبب بھی خاص شہرت رکھتے تھے- میر احمد حسین کا شمار بستی کے معززین میں ہوتا تھا-

منیر کا سلسلۂ نسب حضرت علی نقی سے ملتا ہے- منیر کے مورث اعلیٰ سید بہاء الدین گردیزی' سلطان شمس الدین التمش کے زمانہ میں عرب سے ہندوستان وارد ہوئے (۵)- جب علاء الدین خلجی

نے گجرات دوبارہ فتح کیا (۱۲۹۷ھ) تو آپ ملتان سے شکوہ آباد آگئے۔ یہاں اس گھرانے نے کشاورزی پر گزران معاش کی۔ مغلیہ عہد میں بھی یہی مشاغل رہے۔ ساتھ ساتھ علمی ذوق بھی رو بہ ترقی رہا۔ سید بہاء الدین علوم ظاہری و باطنی میں یگانۂ روزگار تھے اس لئے ہندوستان میں ان کی خاص قدر ومنزلت تھی۔ آپ کے اہل خاندان اپنی لیاقت اور جوہر شرافت کے لحاظ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ چنانچہ سید شرف الدین علی خاں کو جو سید منیر کے پردادا تھے، محمد شاہی دور میں شکوہ آباد کی صوبہ داری تفویض کی گئی۔

شکوہ آباد کی صوبہ داری کے آغاز ہی سے ان کے اہل خاندان نے اس قصبے کو اپنا وطن بنالیا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ منیر کے والد، میر احمد حسین شاد ان ہی شرف الدین علی خاں کے پوتے تھے۔

جب صدر نظامت الہ آباد سے اٹھ کر آگرہ آیا تو مسٹر اسٹاکول نے جو آگرہ اور مین پوری کے حاکم تھے، میر احمد حسین کو آگرہ بلایا اور وہ صدر نظامت میں سررشتہ دار ہوگئے (۶)۔ بہت عرصہ تک منیر کے والد گرامی اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔

اب میر احمد حسین شاد نے آگرے ہی میں مستقل رہائش اختیار کرلی اور وہیں مرزاؤں کے خاندان میں دوسری شادی کی۔ شاد کی پہلی بیوی اٹاوہ کے قاضی جان علی کی دختر تھیں۔ ان سے منیر کے سوتیلے بھائی سید اولاد حسین پیدا ہوئے۔ منیر، شاد کی دوسری بیوی کے بطن سے تھے۔ ان کے علاوہ ان کی ایک بڑی بہن اور ان کے ایک چھوٹے بھائی سید حسین مطیر بھی تھے۔ منیر کی ننھیال میں شعروشاعری کا بڑا چرچا تھا۔ چنانچہ اس خاندان میں کئی مشہور شاعر گزرے ہیں جن میں مرزا عاشق حسین بزم آفندی، مرزا آغا حسین آغا اور مرزا علی حسین قیصر کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ میر احمد حسین کا انتقال ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء کو شکوہ آباد میں ہوا (۷)۔

منیر کی والدہ کے بارے میں صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ آگرے کے ایک معزز گھرانے کی بیٹی تھیں۔ ان کا انتقال ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۵ء میں ہوا (۸)۔

منیر کی پیدائش شکوہ آباد میں ۹ ذی الحجہ ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۱۸۱۸ء بروز سنیچر ہوئی۔ صاحب تذکرہ " سراپاسخن " سید محسن علی خان محسن لکھنوی منیر کا مولد لکھنؤ بتاتے ہیں (۹) جو درست نہیں۔ کیونکہ منیر کے بیان سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ منیر ابتدائے عمر میں لکھنؤ آئے

اور یہیں انہوں نے ہوش سنبھالا اور بولنا سیکھا۔

شکوہ آباد ایک قصبہ ہے آباد
وہی ہے مسکن آبا و اجداد

سنبھالا ہوش جا کر لکھنؤ میں
ہوا گل چیں ریاضِ گفتگو میں (۱۰)

شکوہ آباد میں رہنے کے باوجود 'منیر کا ایک قریبی تعلق آگرہ اور لکھنؤ کے ساتھ ابتدائے عمر ہی سے قائم رہا۔ آگرہ تو خیر ان کی ننہیال تھی مگر لکھنؤ میں بھی ان کی قرابت داری تھی چنانچہ ان کے برادر بزرگ سید اولاد حسین کی شادی لکھنؤ ہی میں ہوئی۔

منیر کے قریبی اعزاء میں دو بھائی تھے اور ایک بہن۔ بڑے بھائی کا نام سید اولاد حسین تھا۔ یہ اگرچہ منیر کے سوتیلے بھائی تھے مگر والد کی وفات کے بعد انہوں نے منیر کی پرورش اور دیکھ بھال بہت محبت سے کی۔ سید اولاد حسین کا شمار اپنے وقت کے مجتہدین میں ہوتا تھا۔ ان کو بھی اپنے والد کی طرح علوم معقول و منقول سے گہرا لگاؤ تھا۔ سید اولاد حسین ایک حقیقی عالم تھے۔ مذہبیات کے علاوہ منطق، علم الکلام، ریاضی وغیرہ میں بھی یدطولیٰ رکھتے تھے۔ یہ سب علوم انہوں نے اپنے والد ہی سے حاصل کئے تھے۔ سید اولاد حسین ہگلی ضلع کلکتہ کے ایک مدرسہ میں ملازم تھے۔ ان کی تنخواہ ساٹھ روپے ماہوار تھی۔ منیر کے برادر بزرگ کی شادی حکیم ظفر علی خان، رئیس اعظم لکھنؤ کی دختر سے ہوئی تھی۔ منیر کے بھائی کا انتقال ۱۲۵۶ھ میں عالم جوانی میں لکھنؤ ہی میں ہوا (۱۱)۔

منیر کے دوسرے بھائی کا نام جو عمر میں منیر سے کم تھے، سید حسین تھا۔ مذہبیات کے علاوہ ان کو اپنے بڑے بھائی سید اولاد حسین کے برعکس شعروادب سے بھی لگاؤ تھا۔ فن شعر میں وہ منیر ہی سے مشورہ کرتے تھے بلکہ انہوں نے اپنا تخلص بھی بھائی کے تخلص منیر کی صوتی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے مطیر اختیار کیا تھا۔ بعض تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ منیر کے باقاعدہ شاگرد تھے۔ ۱۲۶۴ھ میں جس وقت منیر نے اپنا دیوان اول "منتخب العالم" مرتب کیا، مطیر حیات تھے۔ مطیر کا انتقال، عین عالم شباب میں ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۴۹ء میں ہوا (۱۲)۔ منیر نے ان ہی ایام میں ایک

غزل لکھی، مطیر کے انتقال سے دو برس پہلے (۱۲۶۴ھ) منیر کی محبوبہ کی وفات ہو چکی تھی، غزل کے مقطع میں اس طرف اشارہ موجود ہے۔

جانِ جہاں کو پہلے تو کھو بیٹھے اے منیر
بھائی کو آج دفن کیا خاک کے تلے (۱۳)

منیر کی بڑی بہن کا انتقال جن کا نام معلوم نہیں ہو سکا، ۱۲۷۹ھ میں اس وقت ہوا جب منیر جنگ آزادی میں شرکت کے جرم میں انڈمان میں قید کاٹ رہے تھے (۱۴)۔ بہن کی وفات سے کچھ دن پہلے اسی سال ان کی اہلیہ کا بھی انتقال ہوا جو شکوہ آباد میں اپنی نند کے ساتھ رہتی تھیں۔ ۱۲۷۹ھ کا سال مرگ عزیزاں کے لحاظ سے منیر پر خاصا بھاری تھا۔ رفیقۂ حیات کے اچانک بچھڑ جانے کی خبر پاکر، منیر سخت صدمے سے دو چار ہوئے (۱۵)۔ منیر جن دنوں انڈمان میں قید وبند کی اذیتیں برداشت کر رہے تھے، ان کے اہل خاندان سخت پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ منیر کی جدائی اور انکے قیدوبند کی اذیتوں کا دکھ بالآخر ان کی زوجہ اور پھر ان کی بڑی بہن کی موت کا سبب بنا۔

منیر کی اولاد میں صرف ایک صاحب زادہ کا پتہ چلتا ہے جن کا نام سید ابو محمد اور بدر تخلص تھا۔ بدر رام پور ہی میں اپنے والد کے ساتھ رہتے تھے منیر اپنے ایک خط میں جو انہوں نے رام پور سے اپنے شاگرد سید محمد نوح شہیر کے نام ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۹۷ھ کو لکھا ہے، بدر کا ذکر کرتے ہیں (۱۶) یا پھر اس قصیدے میں جو نواب کلب علی خاں کی مدح میں ہے اور جس میں رام پور کے صاحبان کمال کا ذکر کیا گیا ہے، بدر کا نام موجود ہے۔

بدر، شاداں، غمیں، غنی ہر دم
رہتے ہیں مدح خوانِ سرکاری (۱۷)

گویا ابو محمد بدر اپنے والد گرامی کے توسط کے سبب عہد خلد آشیاں میں سرکاری ملازم تھے۔ اس سے زیادہ اور کوئی بات بدر کے بارے میں منیر کی کسی تحریر میں نہیں ملتی۔ معاصر تذکروں میں بھی بدر کا حال کہیں درج نہیں۔ حسن افضل بدر، سید ابو محمد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ کسی ممتوعہ کے بطن سے تھے (۱۸)۔ اس امر کی تصدیق اور کسی ذریعہ سے نہیں ہوتی۔ "مسدس جشن بے نظیر" میں میریار علی جان، بدر کے بیٹے سید محمد محسن ہلال کے حوالے سے ان کے حالات پر اس

طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

"اتفاق سے سید محسن صاحب ہلال ابن سید ابو محمد بدر تخلص سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بیان کیا کہ جناب بدر کے چار اولادیں تھیں۔ ایک لڑکا، تین لڑکیاں۔ دو لڑکیاں غیر شادی شدہ انتقال کر گئیں۔ ایک لڑکی کی شادی اعجاز حسین صاحب افغان پوری سابق سب انسپکٹر آبکاری رام پور سے ہوئی۔ سید محمد محسن صاحب کی عمر اب ساٹھ سال کے قریب ہے۔ جناب بدر کے انتقال کے وقت ان کی عمر چھ مہینے تھی۔ انہیں کل حالات اپنی والدہ صاحبہ سے معلوم ہوئے۔ جناب بدر رامپور کی عدالت دیوانی میں حکم نویس بھی رہے ہیں۔ ان کا انتقال ۳۲ سال کی عمر میں ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں رام پور میں ہوا۔ اور تکیہ شاہ رفیق کے قبرستان میں دفن ہوئے (۱۹)۔"

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ منیر کے بعد بھی شعروسخن سے دلچسپی ان کے اہل خاندان میں باقی رہی۔ ابو محمد نے بدر تخلص اپنے والد کے تخلص کی مناسبت سے اختیار کیا اور اسی طرح بدر کے بیٹے سید محمد محسن کا تخلص ہلال تھا۔ اپنی کوششوں کے باوجود منیر کے بیٹے اور ان کے پوتے شعروسخن میں کوئی خاص امتیاز حاصل نہ کر سکے اور وہ شہرت جو منیر کے حصہ میں آئی ان لوگوں میں سے کسی کو نہ مل سکی۔

منیر کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے بارے میں کوئی واضح بات معلوم نہ ہو سکی اور نہ خود منیر کے کلام ہی سے ان کی زندگی کے اس پہلو پر کوئی روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی اپنے تحقیقی مقالہ "دبستان دبیر" میں کہتے ہیں کہ ان کے والد نے ان کو نہایت اعلیٰ تعلیم دلائی (۲۰)۔ لیکن وہ ہمیں ان اساتذہ کے نام نہیں بتاتے جن کی رہنمائی میں منیر نے ابتدائی علمی مراحل طے کئے۔ عام خیال یہی ہے کہ منیر نے فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے والد بزرگوار سید احمد حسین سے اور علوم دین کی تکمیل اپنے بڑے بھائی مولوی سید اولاد حسین سے کی جن کا شمار اپنے وقت کے مجتہدین میں ہوتا تھا۔ انہوں نے اس انداز سے تحصیل علم کی کہ بچپن ہی میں لوگ منیر کی استعداد ذہنی اور فطری ذکاوت کے معترف ہو گئے تھے۔

منیر کی کلیات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو اردو کے علاوہ فارسی پر کامل دستگاہ

حاصل تھی- چنانچہ ان کے یہاں فارسی کلام اور فارسی نثر بھی دیباچہ و رقعات کی شکل میں موجود ہے جس سے ان کی وسعت علمی کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں-

منیر کی شادی ان کے والد کے انتقال کے ایک برس بعد یعنی ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء میں ہوئی (۲۱)- گویا والدین کی حیات میں منیر مجرد ہی رہے-

منیر شکل وصورت کے اعتبار سے ایک خوبصورت آدمی تھے اور ان تمام مصائب کو جھیلنے کے باوجود جو انتہائی شدید قسم کے قرار دیئے جا سکتے ہیں ان کی صحت بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھی-

منیر جوانی میں کشیدہ قامت تھے اور بدن چھریرا تھا لیکن عمر کے ساتھ جسم کسی قدر دوہرا ہو گیا جس کی وجہ سے ان کا قد متوسط معلوم ہونے لگا تھا- ان کا چہرہ کتابی ' پختہ گندمی رنگ' کشادہ پیشانی' پیوستہ ابرو' بڑی بڑی روشن آنکھیں' بھرے ہوئے گال ' ستوان ناک' باریک دانت' خشخشی داڑھی جو چالیس قدم سے نظر آجائے- مونچھیں درمیانی قسم کی جو عموماً" کتری ہوئی رہتی تھیں- سر پر پٹے تھے اور آواز درمیانی قسم کی تھی- شعر بہت دلکش انداز میں پڑھتے تھے- شعر پڑھتے ہوئے حرکات کم سے کم کرتے مگر شعر کو دوبار ضرور پڑھتے تھے- چلتے تو سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے جس سے ان کی طبیعت کی سلامت روی کا اندازہ ہوتا تھا- گرمیوں کے موسم میں لباس میں شبنم یا لکھنؤ کی چکن کا کرتا' اوپر ململ یا باریک تن زیب کا دوہرے بندوں کا انگرکھا اور چوڑی دار پاجامہ- سر پر چوگوشہ ٹوپی' کبھی لکھنؤ کی وضع کی دو پلی ٹوپی بھی پہن لیتے تھے- سردیوں میں روئی دار بنڈی اور اس کے اوپر شیروانی زیب تن کرتے- کبھی کبھی ریشمی یا جالی کا گوٹ دار چکن کا رومال زیب دوش ہوتا- پاؤں میں کبھی سلیم شاہی جوتی اور کبھی لکھنؤ کی ساخت کی زرد مخملی گرگابی پہنتے تھے (۲۲)-

منیر نے ہوش سنبھالا تو گھر میں شعروشاعری کا چرچا تھا- طبیعت میں ذوق شعری موجود تھا جس کو ساز گار حالات نے اور بھی ترقی دی- آگرہ میں ان کی ننہیال تھی جہاں ان کا آنا جانا اکثر رہتا تھا- آگرہ میں ان دنوں مشاعرے ہوتے رہتے تھے- خلیفہ گلزار علی اسیر' حکیم غلام قطب الدین خاں باطن' سید مدد علی تپش 'جناب ساحر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر کے دم سے آگرہ میں شعروسخن کی گرم بازاری تھی- غزل گوئی اور غزل سرائی کو بہ نظر استحسان دیکھا جاتا تھا- آگرہ کی ان ادبی محفلوں نے منیر کی شعرپسند طبیعت کو مہمیز کیا اور وہ نو عمری ہی میں اچھے شعر کہنے لگے- منیر کے

اپنے بیان کے مطابق انہوں نے شعر گوئی کا آغاز چودہ برس کی عمر میں کیا جیسا کہ ان کے خود نوشت سوانحی اشارات سے ثابت ہے۔ وہ ۱۲۸۶ھ میں اپنی شعر گوئی کی مدت ۳۶ برس بتاتے ہیں (۲۳)۔ گویا انہوں نے پہلا شعر ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) کے لگ بھگ کہا۔ عصری شہادتوں سے آگرہ کے ایک معرکتہ الآرا مشاعرہ میں ان کی شرکت کا پتا چلتا ہے جس کے بعد منیرؔ نظام الدولہ کے ہمراہ بہ صیغۂ مصاحبت و ملازمت آگرہ سے کان پور آگئے۔ اس مرحلہ پر نواب صاحب کی سفارش سے بذریعہ مراسلت شیخ امام بخش ناسخ کے ساتھ ان کی شاگردی کا تعلق استوار ہوا۔ منیر کی اپنے استاد شیخ ناسخ سے پہلی ملاقات کان پور میں ہوئی جہاں شیخ صاحب نواب امین الدولہ مہر کے یہاں بطور مہمان قیام پذیر تھے۔ چند روز کے بعد ہی ناسخ نے اپنے شاگرد رشید منیر کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی کہ ایسا ذہین و ذکا اور فہم رسا کا مالک کوئی اور شاگرد ان کے شاگردوں میں نہیں ہے۔ منیر کو بحث مباحثے کا بڑا شوق تھا جس سے استاد ناسخ بہت چکراتے تھے، تاہم وہ خواجہ وزیر اور منشی منیر کو اپنی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور سمجھتے تھے (۲۴)۔ ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء میں ناسخ جب لکھنؤ واپس آگئے تو انہوں نے منیر کو اپنے قابل شاگرد علی اوسط رشک کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد منیر مدت تک جناب رشک کی صحبت میں رہے اور ان سے اپنے کلام پر برابر اصلاح اور مشورہ لیتے رہے۔ رشک (۲۵) ہی کے ہمراہ وہ لکھنؤ، کان پور، مرشد آباد اور نزدیک و دور کے دوسرے شہروں کے مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے تھے (۲۶)۔ یہ سلسلہ ۱۲۶۷ھ تک قائم رہا جب تک رشک اپنے پوتے کے انتقال کے دو برس بعد مستقل طور پر کربلائے معلیٰ نہیں چلے گئے۔ وہیں رشک نے ۱۲۸۴ھ میں انتقال کیا۔ منیر کو اپنے اساتذہ سے بحدِ عقیدت النیت اور لگاؤ تھا۔ منیر کے دیوان اول "منتخب العالم" میں منیر کی ایک غزل ہے جس کے مقطع میں شیخ ناسخ کی اصلاحوں کو اپنی فکر کی بلندی کا سبب قرار دیا ہے۔

حضرتِ ناسخ کی اصلاح اس غزل پر ہے منیر
آج رتبہ میری فکرِ پست کا بالا ہوا (۲۷)

عزائی اصناف سخن میں منیر نے مرزا دبیر سے استفادہ کیا (۲۸)۔

منیر نے ۱۲۵۰ھ کے لگ بھگ نواب نظام الدولہ کی ملازمت اختیار کی اور ۱۲۵۶ھ تک وہ ان

کے ساتھ کان پور ہی میں مقیم رہے۔ یہاں نواب امین الدولہ بہادر مہر کی عنایات کے سبب جو کان پور ہی میں مقیم تھے، منیر نے وہاں قیام کی مدت کسی قدر آرام وسکون سے بسر کی۔ پھر کچھ ایسے حادثات رونما ہوئے کہ منیر کے لئے کان پور میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ ان پریشانیوں کی نوعیت کیا تھی، منیر اس سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں کرتے بلکہ صرف "حوادث گوناگوں" کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ خیال یہی ہے کہ منیر وہاں مالی مشکلات کا شکار ہوئے اور اپنے غیر معمولی اخراجات کے سبب بہت زیادہ مقروض ہو گئے۔ اس خیال کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ جب تک معین الدولہ سید باقر علی خاں بہادر ظفر جنگ خلف ثالث نواب معتمد الدولہ نے منیر کو قرض کے اس بارگراں سے سبکدوش نہیں کر دیا، وہ دوبارہ کان پور نہیں گئے۔ البتہ ایک بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ حادثات جس قسم کے بھی تھے ان کی نوعیت ایسی ضرور تھی کہ منیر ان پر پردہ پڑا رہنا ہی اچھا سمجھتے تھے۔ کلیات منیر (دیوان اول و دوم) کے دیباچہ کی عبارت یہ ہے۔

"آخر بحوادث گوناگوں مبتلا گردیدہ بہ بیت السلطنت لکھنؤ شتافتم و بقول فخر المتاخرین مولانا غالب دہلوی۔

اندراں بقعۂ معمور ز دل تنگیٔ خویش
حسرت آگیں چو گناہگار بہ زنداں رفتم (۲۹)

اس عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہو گا کہ منیر کان پور سے نکلنا نہیں چاہتے تھے مگر حالات نے ان کو اس درجہ مجبور کر دیا تھا کہ وہ ناچار یہاں سے نکل کر ۱۲۵۷ھ میں لکھنؤ پہنچے (۳۰)۔ لکھنؤ میں مستقل ذریعۂ معاش نہ ہونے کے سبب منیر نے کافی مدت انتہائی مفلوک الحالی اور عسرت میں بسر کی۔ اس دوران میں منیر نے بڑی مصیبتیں برداشت کیں (۳۱)۔ بالآخر توفیق باری نے دستگیری کی اور منیر کے استاد سید علی اوسط رشک کی سفارش پر ظفرالدولہ نواب علی اصغر خاں بہادر (۳۲) نے منیر کو اپنے زمرۂ ملازمین میں شامل کر کے معاش کی طرف سے بے فکر کر دیا۔

نواب علی اصغر خاں بہت جاہ وجلال کے رئیس تھے۔ زہد، تقویٰ، سخاوت اور رحمدلی میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ خود بھی صاحب علم تھے اور اہل علم کے بڑے قدر داں تھے۔

منیر ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء میں لکھنؤ پہنچے۔ اس وقت ان کی عمر چوبیس برس سے زیادہ نہ

تھی۔ یہ زمانہ محمد علی شاہ کا دور آخر تھا۔ ان دنوں لکھنؤ میں شعروشاعری کی محفلیں عام تھیں۔ بادشاہ اور امراء دربار کرتے، گھر گھر رقص و سرود کے جلسے ہوتے۔ درگاہوں اور امام باڑوں کی رونق ایک جداگانہ کشش رکھتی تھی۔ منیر شکوہ آبادی وہاں پہنچے تو بادشاہ کی شان وشوکت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی وہاں کی عیش ونشاط سے بھرپور زندگی جس میں مذہب سے یک گونہ لگاؤ بھی موجود تھا، منیر کے لئے اپنی عمر اور مزاج کے لحاظ سے خاص دلکشی کا باعث تھی، یہاں تک کہ وہ لکھنؤ کو جنت کہے بغیر نہ رہ سکے۔

پیشِ نظر ہے آج گلستانِ لکھنؤ
ہر ایک سمت نور کا جلوہ ہے دیکھ لو

جلسے مشاعروں کے ہیں یاروں کی صحبتیں
ہر ایک فنِّ شعر میں یکتا ہے دیکھ لو

پریوں کی دید ہے سرِ بازار رات دن
ہر کوچہ میں طلسم کا میلہ ہے دیکھ لو

کملی سے بھی دو شالوں کو پایا یہاں ذلیل
کشمیر سے یہ شہر زیادہ ہے دیکھ لو

کس طرح حالِ حشمتِ سلطاں بیان ہو
بس قدرتِ خدا کا تماشا ہے دیکھ لو

فیاض ہیں تمام امیر اس دیار کے
گھر گھر میں رقص وعیش کا جلسہ ہے دیکھ لو (۳۳)

معراج فاضلوں کو ہے عرشِ کمال پر
ہر ایک اپنے رتبے میں اعلیٰ ہے دیکھ لو

درگاہیں اور تعزیہ خانے ہیں نور کے
یہ فیضِ بزمِ ماتمِ مولا ہے دیکھ لو (۳۴)

اس شہر کو میں کیوں نہ کہوں جنتِ نہم
اس کا نظیر ہند میں عنقا ہے دیکھ لو

یہ قطعہ تاریخ ہو سکتا ہے کہ فنی اعتبار سے کوئی خاص شعری قدروقیمت نہ رکھتا ہو مگر اس لحاظ سے یقیناً" قابل توجہ ہے کہ اس کو پڑھ کر ہماری آنکھوں کے سامنے ایک دریچہ سا کھل جاتا ہے جس میں ہم اس خاص عہد کے لکھنؤ کی جیتی جاگتی تصویریں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں- قطعہ کی ردیف "دیکھ لو" اپنی جگہ ایک مستقل دعوت نظارہ ہے- ان شعروں میں لکھنؤ کی خارجی زندگی کے بعض قابل ذکر پہلو ہی سامنے نہیں آتے بلکہ اس داخلی کیفیت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے جو اس شہر رنگ وبو میں آنے کے بعد، منیر کے نوجوان وحساس ذہن پر مرتب ہوئی تھی-

لکھنؤ میں منیر کا قیام دوبرس رہا- اس دوران میں یعنی ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں انہوں نے کلکتہ کا سفر بھی کیا- اس سفر کی غرض و غایت کیا تھی اس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں کیونکہ کوئی داخلی یا خارجی شہادت اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی نہیں کرتی- خیال یہی ہے کہ کسی قدردان کی تلاش ان کو وہاں تک لے گئی- کلکتہ میں ان کا قیام کئی مہینے تک رہا- اس سفر میں منیر کو خاصی تکلیف ہوئی کیونکہ اس سفر کے دوران ان کی بغل میں پھوڑا نکل آیا تھا جس پر عمل جراحی کیا گیا- ڈاک کی پالکی میں یہ سفر طے ہوا (۳۵)- کہار کچھ زیادہ ہی تیز رفتار تھے جن کے چلنے سے ہچکولے لگتے اور بغل کے تازہ زخم میں ٹیسیں پیدا ہوتیں- کلکتہ میں منیر نے کئی مشاعروں میں شرکت کی- قیام کلکتہ کے دوران میں منیر کو مغربی طرز بودوباش کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا- زندگی کے یہ طور طریقے چونکہ برصغیر کے رہنے والوں کے اطوار سے بہت مختلف تھے اس لئے منیر کے حساس دل ودماغ نے بجا طور پر ان سے اثرات قبول کئے جس کا اظہار ان کے اس دور کے کلام سے ہوتا ہے- کلکتہ ہی میں منیر نے الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کا تماشا دیکھا- یہ تجربہ ان کے لئے بالکل انوکھا تھا- کلکتہ میں منیر کا دل نہیں لگا کیونکہ ان کو لکھنؤ کی یاد برابر ستاتی رہی، خصوصاً" اپنے استاد سید علی اوسط رشک سے دوری ان کے لئے ناقابل برداشت تھی-

اگلے برس یعنی ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء میں منیر دوبارہ لکھنؤ آگئے اور اسی سال نواب معین الدولہ

ظفر جنگ باقر علی خاں جو وزیر اودھ کے فرزند تھے' منیر کو اپنے ساتھ کان پور لے گئے۔ کان پور جانے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ قرضہ تھا جو منیر کے اوپر تھا اور جس کے سبب ان کو کان پور چھوڑنا پڑا۔ نواب موصوف نے وہ تمام قرضہ اپنے پاس سے ادا کردیا اور یوں منیر نواب باقر علی خاں کی مصاحبت میں کان پور پہنچ گئے۔

نواب باقر علی خاں خود ایک اچھے اور کہنہ مشق شاعر تھے اور ساحر تخلص کرتے تھے۔ وہ خود صاحب علم تھے اور اہل علم کی قدردانی ان کا شعار تھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دارو گیر میں جہاں دوسرے امراء ونوابین انگریزوں کے ظلم وتعدی کا شکار ہوئے' نواب باقر علی خاں کو بھی گرفتار کر لیا گیا مگر چونکہ ان کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہو سکا لہٰذا ۱۲۷۵ھ / ۵۹ - ۱۸۵۸ء میں ان کو قید فرنگ سے رہائی مل گئی۔ نواب کا انتقال کان پور ہی میں ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء میں ہوا (۳۶)۔

اس مرتبہ کان پور میں منیر کا جی نہیں لگا۔ دل لگتا بھی کیسے' وہ ابھی وہاں پہنچے ہی تھے کہ ان کے مخالفین دشمنی پر کمربستہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ان کا جینا دوبھر کر دیا۔ دشمنوں نے کچھ ایسی سازشیں کیں کہ منیر شدید پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ اگر ان صبر آزما حالات میں مولانا احمد حسن خاں عروج (۳۷) ان کی اعانت نہ فرماتے تو بقول منیر ان کے وجود کا غبار بھی صحرائے عدم میں پہنچ جاتا۔

ان ہی دنوں نواب یوسف علی خاں (۳۸) نے جو اس وقت ولی عہد ریاست رام پور تھے' ازراہِ قدردانی منیر کو رام پور طلب کیا۔ انہوں نے اپنے خط کے ساتھ مصارف سفر بھی بھیجے مگر ان دنوں منیر دشمنوں کی ریشہ دوانیوں میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ ان کے لئے کان پور سے قدم باہر نکالنا قریب قریب ناممکن تھا۔ انہیں امید تھی کہ کچھ دنوں میں حالات بہتر ہو جائیں گے تب وہ رام پور جا سکیں گے' اس لئے منیر نے شکریہ کے ساتھ زاد راہ واپس کر دیا اور ایک عرضی میں اپنی مفصل کیفیت سے نواب یوسف علی خاں کو آگاہ کیا تاکہ ان کا دل میلا نہ ہو۔

اس دوران میں منیر کوشاں رہے کہ کوئی مستقل صورت کان پور سے لکھنؤ واپس آنے کی نکل آئے۔ کان پور کے قیام کے دوران انہوں نے کچھ غزلیں ایسی بھی کہی ہیں جن میں لکھنؤ کے عیش و آرام کو ایک عجیب حسرت کے ساتھ یاد کیا ہے' ان غزلوں میں کان پور سے لکھنؤ جانے کی تمنا بہت نمایاں ہے۔

غم خانہ کان پور اگر ہے تو ہو منیر
صد شکر لکھنؤ تو ہے دولت سرائے عیش (۳۹)

بالآخر ان کی یہ آرزو بر آئی اور امیر فیاض نواب اسدالدولہ، رستم الملک سید محمد ذکی متخلص بہ ذکی عرف نواب بہادر (۴۰) کے یہاں منیر کو ملازمت مل گئی۔ انہوں نے منیر کو اپنے کلام کی اصلاح پر مامور کیا۔ منیر نے کان پور سے لکھنؤ کے لئے رخت سفر باندھا تو ان کا دل اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھا کہ خدا نے بالآخر ان کی دلی تمنا پور کر دی۔

کنپو سے لکھنؤ کو چلا ہوں اب اے منیر
بارے دعا قبول کی، پروردگار نے (۴۱)

منیر جو ایام گزشتہ میں انتہائی پریشانیوں کا شکار رہ چکے تھے اس قدر افزائی سے ان کو دوبارہ اطمینان حاصل ہوا۔

۱۲۵۶ھ سے ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۰ء تا ۱۸۴۴ء) تک کا عرصہ منیر کی زندگی میں پریشانیوں کا زمانہ تھا۔ اس دوران میں انہوں نے کان پور، لکھنؤ، کلکتہ اور دوسرے شہروں کے سفر بھی کئے۔ اپنی اس آوارہ مزاجی کا ذکر انہوں نے بڑے لطیف پیرائے میں کیا ہے، کہتے ہیں۔

خاک اڑاتا جابجا آوارہ پھرتا ہے منیر
کڑھتی ہے میری بلا روز ایسے واہی کیلئے (۴۲)

۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) تک منیر شکوہ آبادی، نواب اسدولہ سید محمد ذکی کی ملازمت میں رہے۔ منیر کی شہرت اب لکھنؤ سے نکل کر دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی تھی اور لوگ ان کو استاد تسلیم کرنے لگے تھے۔ لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی منیر کا ایک تعلق فرخ آباد کی ریاست کے ساتھ قائم تھا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں جشن نوروز کے موقع پر ایک قطعۂ تہنیت نواب حشمت جنگ تجمل حسین خاں (۴۳) کی خدمت میں بھیجا۔

مرے نوّاب کے گھر آج ہے نوروز کا جلسہ
فروغِ اختر و دولت خداوندا ابد تک ہو

بطرزِ بنیات اے دل کہی تاریخ یوں میں نے
الٰہی جشنِ کامل رنگ مسعود و مبارک ہو (۴۴)

نواب تجمل حسین خاں نے ازراہ قدردانی منیر کو فرخ آباد طلب کیا اور سفر خرچ بھی بھیجا۔ جس شفقت سے انہوں نے اپنے خط میں شوق ملاقات کا اظہار کیا تھا منیر اس کو پڑھ کر با دل نخواستہ لکھنؤ چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

منیر نے اگرچہ لکھنؤ بہت دل گرفتگی کے عالم میں چھوڑا تھا مگر جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ ان کا فرخ آباد آنے کا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔ منشی منیر فرخ آباد پہنچے تو ان کی کمال قدردانی ہوئی۔ نواب تجمل حسین خاں ان کو ہر موقع پر انعام واکرام سے نوازتے رہتے تھے۔

نواب فرخ آباد کے یہاں صاحبان علم کا جمگھٹا رہتا تھا' ان کی ذی علم اور صاحب وقار شخصیت کا یہ اثر تھا کہ دور دور سے شعراء اور علماء کھنچ کر چلے آئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ منیر کو ایک عمر کے بعد ایسا سرپرست ملا تھا جو ان کے کمال فن کا شناسا تھا۔ نواب تجمل حسین خاں صاحبِ علم وفضل بھی تھے اور ان کو منیر کی طرح مذہبیات سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ ان کی محفل میں اکثر علمی ومذہبی نکات زیر بحث آتے جن میں دوسرے صاحبان علم وفضل کے ساتھ منیر بھی شریک ہوتے۔ اسی ذہنی و روحانی یگانگت کے سبب منیر کو جو خوشی نواب تجمل حسین خاں کی صحبت سے حاصل ہوئی شاید اس سے پہلے اور کسی مربّی سے نہیں ملی تھی۔ معاشی فارغ البالی کے سبب فرخ آباد کے قیام کے دوران میں ان کی طبع شاعرانہ کو اپنی جولانی کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آیا مگر اس تمام عیش و راحت کے باوجود لکھنؤ کی یاد' ان کے دل میں برابر چٹکیاں لیتی رہی۔

لکھنؤ مجھ سے چھڑایا میری قسمت نے منیر
کر دیا بلبلِ شیدا کو چمن سے باہر (۴۵)

لکھنؤ کے احباب کے علاوہ اپنے شفیق استاد جناب علی اوسط رشک سے دوری بھی ان کیلئے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔

ہوں جدا رشک سے استاد کی خدمت سے منیر
فرخ آباد میں کیوں کر ملے آرام مجھے (۴۶)

نواب تجمل حسین خاں ہر موقع پر برابر منیر کو انعام واکرام سے نوازتے رہتے جس کی بدولت مختصر مدت میں منیر کی مالی حالت کچھ سے کچھ ہو گئی۔

منیر کے لئے آرام وسکون کے یہ تین برس جلد گزر گئے - نواب تجمل حسین خاں نے جن سے منیر کو کمال محبت تھی، ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں عین عالم شباب میں بہ عمر ۲۴ برس انتقال کیا۔

نواب فرخ آباد کی مصاحبت ہی کی بدولت قلیل مدت میں منیر کی شہرت کا ڈنکا فرخ آباد میں بجنے لگا اور وہاں کے اہل علم اور امراء آپ کے شاگرد ہونے لگے جن میں سرفہرست نام نواب واجد علی خاں رضواں ابن نواب نجابت علی خاں نواسہ نواب مظفر جنگ اور منشی مادھورام جوہر کے ہیں۔ نواب تجمل حسین خاں کی اچانک وفات سے دل گرفتہ منیر نے ۱۲۶۶ ھ (۱۸۵۰ء) تک فرخ آباد ہی میں قیام کیا۔ نواب تجمل حسین خاں کی وفات کے بعد کچھ مدت منیر نے پریشانی اور سرگرانی میں بسر کی۔

اسی زمانے میں میں راجہ الور اور فرماں روائے دھولپور نے بڑی آرزو سے منیر کو خط لکھے کہ وہ ان کے یہاں آجائیں بلکہ انہوں نے بار بار زاد راہ بھی بھیجا مگر منیر نے پسند نہیں کیا کہ دور دراز علاقوں میں جا کر باقی عمر عزیز تلف کی جائے۔ اس کے علاوہ ان کے شاگرد عزیز لالہ مادھورام جوہر کی محبت نے جو فرخ آباد ہی میں رہتے تھے ان کو اس سفر سے باز رکھا۔فرخ آباد کے قیام کے دوران بہرحال منیر نے نئے نواب تفضل حسین خاں(۴۷) سے راہ و رسم قائم رکھی۔

۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) ہی میں منیر کو ایک جذباتی المیے سے دو چار ہونا پڑا جب کچھ مدت بیمار رہ کر ان کی محبوبہ کا انتقال ہو گیا۔ منیر کی محبوبہ کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک حسین طوائف تھی جو ناچ گانے کے علاوہ علم مجلسی اور سخن فہمی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ وہ ہر چند ایک طوائف تھی مگر منیر کے ساتھ اس کا اخلاص حد درجہ کا تھا۔ منیر کے حالات اگرچہ ان دنوں دگرگوں تھے مگر اس نے کبھی عام طوائفوں کے برعکس دولت کا لالچ نہیں کیا بلکہ منیر کے مقابلہ میں امراء کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتی تھی۔ ان دنوں منیر اور اس کی پر خلوص محبت کے قصے زباں زدعام تھے۔ منیر شکوہ آبادی کی محبوبہ کا انتقال عین جوانی یعنی اٹھارہ برس کی عمر میں ہوا۔ یہ صدمہ منیر کے لئے انتہائی صبر آزما تھا۔

ان ہی دنوں میں منیر نے کان پور کا سفر بھی کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس سفر کا محرک اپنے ممدوح نواب احمد حسین خاں سالک سے اشتیاق ملاقات رہا ہو، کان پور سے منیر باندہ گئے اور وہاں نواب علی بہادر (۴۸) کے دربار میں کچھ مدت قیام کیا۔ منیر باندہ سے فرخ آباد کن حالات میں واپس آئے اس کے بارے میں صرف قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جن توقعات کے ساتھ باندہ گئے وہ پوری نہ ہو سکی ہوں یا پھر ان کی بعض ذاتی مجبوریوں نے ان کو وہاں نہ رہنے دیا ہو۔ باندہ سے آنے کے بعد بہتر حالات کی امید میں منیر نے اپنا ربط باندہ کی ریاست سے قائم رکھا جیسا کہ ان کے منظوم عرائض سے واضح ہے۔

۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) میں منیر کے چھوٹے بھائی سید حسین مطیر کا انتقال فرخ آباد میں ہو گیا (۴۹)۔ برادر حقیقی کی موت کا صدمہ منیر کے لئے بڑا جانکاہ تھا۔ بھائی کے انتقال سے دو برس پہلے ان کی محبوبہ ان کو داغ جدائی دے گئی تھی۔ان پے در پے صدموں کی بدولت رفتہ رفتہ منیر کا دل فرخ آباد سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ ان جذباتی سانحوں سے قطع نظر فرخ آباد میں منیر کی دل بستگی کا ہر سامان موجود تھا۔ وہاں ان کے عزیز شاگرد تھے، دوستوں کی محفلیں تھیں، مشاعرے تھے۔ غرض زندگی کے وہ تمام سامان مہیا تھے جن کے نہ ہونے سے حیات انسانی ایک لق و دق صحرا بن کر رہ جاتی ہے مگر یہ چیزیں تہی دستی کی بدولت آہستہ آہستہ ان کی دسترس سے دور ہوتی جارہی تھیں۔ چنانچہ جب ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) میں نواب علی بہادر نے ان کو باندہ طلب کیا تو منیر نے جو پہلے ہی وہاں جانے کے آرزومند تھے دیر نہیں لگائی اور وہ اسی سال فرخ آباد سے مستقل طور پر باندہ چلے آئے۔ نواب علی بہادر نے ان کو اپنے کلام کی اصلاح پر مامور کیا اور دو سو روپے ماہانہ کا مشاہرہ مقرر فرمایا۔ منیر کے یہاں قیام کا زمانہ آخری ایام کو چھوڑ کر بہت آرام سے بسر ہوا۔

باندہ کی ریاست (۵۰) ہندوستان کے شمال مغربی صوبے میں واقع تھی۔ریاست کا کل رقبہ تین ہزار مربع میل کے لگ بھگ تھا۔ زراعتی اعتبار سے یہاں کی زمینیں کچھ زیادہ زرخیز نہ تھیں۔ نواب علی بہادر بحیثیت ایک شاگرد منیر کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ وہ ان کی خدمت کرنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے اور جب موقع ملتا انہیں انعام واکرام سے نوازتے رہتے تھے جو اکثر منیر کی توقعات سے زیادہ ہوتا تھا۔

منیر باندہ میں نواب علی بہادر کی سرکار میں بہت خوش و خرم رہے۔ وہاں ان کی حیثیت محض

ایک درباری شاعر کی نہ تھی بلکہ ان کو استاد نواب ہونے کے سبب اس سے بھی زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ نواب علی بہادر بعض انتظامی امور میں منشی منیر سے مشورہ بھی طلب کرتے تھے جس سے ان کے مرتبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

چونکہ اب منیر کو معاشی اعتبار سے فراغت حاصل تھی اس لئے قیام باندہ کی اس مدت میں ان کو ادبی و تخلیقی سطح پر زیادہ دل جمعی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ باندہ ہی کے قیام کے دوران انہوں نے اپنے دیوان اول "منتخب العالم" کو جس کی ترتیب و تشکیل وہ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں فرخ آباد میں کر چکے تھے، اب ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۳ء) میں آخری شکل دی اور اپنا معرکتہ الآرا فارسی دیباچہ تحریر کیا۔ نواب علی بہادر نے اس دیوان کی تاریخ کہی۔ ان کے تجویز کردہ نام کو تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی۔

استاد کے دیوان کی ہے مدح محال
برجِ معنی کا نیّرِ اعظم لکھ
تھی فکر علی کو نامِ تاریخی کی
ہاتف نے کہا "منتخب العالم" لکھ (۵۱)

۱۲۶۹ھ (۱۸۵۳ء) ہی میں انہوں نے وہاں اپنا دوسرا دیوان "تنویر الاشعار" مکمل کیا۔

ہوا صد شکر دیوانِ دوم ختم
پسند آیا نہ اس میں طولِ گفتار
منیر اب نامِ تاریخی کی تھی فکر
کہا دل نے کہو، "تنویر الاشعار" (۵۲)

منیر کا قیام باندہ میں کوئی دس برس کے قریب رہا۔ اس دوران میں انہوں نے بہت اچھے دن بھی دیکھے اور بہت برے دن بھی۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء اور منیر شکوہ آبادی
(۱۸۵۷ء — ۱۸۶۵ء)

ہوائے زمانہ کتاب روز وشب کے اوراق الٹتی رہی۔ خوشی اور اطمینان کے یہ آٹھ برس اس طرح گزر گئے کہ ان کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ قاعدہ ہے کہ ابتلاء ومصائب کی مدت کاٹے نہیں کٹتی اور مسرت وعیش کے لمحات اس طرح اڑتے ہیں جیسے قدرت نے ان کو نہایت طاقتور بال و پر عطا کئے ہوں۔ یہی کچھ منیر کے ساتھ بھی ہوا۔ بالآخر انہوں نے ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء کی وہ صبح بھی دیکھی جس کا دامن لاکھوں بے گناہوں کے خون سے آلودہ تھا۔ اسی برس منیر پر دکھوں کے بند دروازے کھلے اور آنے والے دو برسوں کی مدت میں ان کی زندگی عجیب نشیب وفراز سے گزری جس کا شاید انہوں نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔ اس مدت میں قیدوبند کی صعوبتیں بھی شامل تھیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا آغاز ہو چکا تھا اور ہر طرف ظلم وجور کی تند آندھیوں نے انسانی زندگی کے رخت وساز کو پرکاہ سے بھی حقیر سمجھتے ہوئے بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی محض فوجیوں کی ناکام بغاوت نہیں تھی بلکہ ملک کے عام لوگ بھی اس میں برابر کے شریک تھے۔ برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی لوٹ مار' اس کی چیرہ دستیوں اور لارڈ ڈلہوزی کی جابرانہ سرگرمیوں نے سارے ملک میں ایک ہیجان برپا کر رکھا تھا' ان معنوں میں اس تحریک کو بجا طور پر ایک انقلابی تحریک کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہاں اس جدوجہد کے اسباب وعلل پر بحث کرنا طول کلام کے مترادف ہو گا لیکن حقیقت یہی ہے کہ جو نفرت انگریزوں کے طرز عمل کے خلاف یہاں کے لوگوں کے دلوں میں سرایت کر چکی تھی اس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ انگریز یہاں تجارت کے بہانے آئے اور رفتہ رفتہ اپنی عیاریوں کی بدولت یہاں کے حکمران بن بیٹھے۔ انہوں نے اپنی ہوس ملک گیری کی تکمیل کے لئے جو کچھ میسور میں حیدر علی اور ٹیپو اور بنگال میں سراج الدولہ اور دلی میں شاہ عالم اور دوسرے بادشاہوں کے ساتھ کیا وہ لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھا۔ لکھنؤ کی سرزمین پر انگریزوں نے قدم تو دوست اور بہی خواہ بنکر رکھا مگر انہوں نے اول اول سازشوں کے جال پھیلائے اور اصحاب اقتدار کو ترغیب اور لالچ کے ذریعہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ عیش وعشرت کا بازار اس طرح گرم کیا کہ شاہان اودھ ان کے

دست نگر ہو کر رہ گئے۔ حکومت کا نظام درہم برہم ہوا تو ان کو اس قدیم مسلمان ریاست کو ختم کرنے کا ایک جواز ہاتھ آگیا۔ جان عالم واجد علی شاہ کو معزول کرنے کی وجہ بظاہر یہی تھی لیکن عام لوگ اس صورت حال کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ واجد علی شاہ ایک ہر دلعزیز حکمران ہی نہ تھے وہ عوام کے سرپرست' ان کے بزرگ اور رہنما بھی تھے۔ ان کے عیش ونشاط کے قصوں کو خوب خوب ہوا دی گئی تاکہ وہ بدنام ہوں لیکن ان کو بدنام ورسوا کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ واجد علی شاہ ایک قابل حکمران بھی تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اودھ کے علاقہ کی خوشحالی' امن وامان اور نظام ملکی کی صورت حال قرب وجوار کے مقبوضہ انگریزی علاقوں سے کہیں بہتر تھی - واجد علی شاہ نے تخت نشینی کے بعد حکومت کے تمام شعبے جن میں فوج کی کمان بھی شامل تھی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ انہوں نے فوج کی تعداد میں اضافہ کیا جس کا معائنہ وہ خود کیا کرتے تھے حالانکہ ایک ایسے شخص سے جس کا بیشتروقت تہذیبی وعلمی مشاغل میں بسر ہوتا ہو اور جس کی مختلف موضوعات پر کم وبیش ڈیڑھ سو تصانیف ہوں' یہ باتیں بعید از قیاس دکھائی دیتی ہیں۔ انگریزوں کی نظر میں واجد علی شاہ کا اپنی فوجی قوت کو ترقی دینا اور فوجی امور میں اس طرح دلچسپی لینا کوئی پسندیدہ فعل نہ تھا۔ یوں تو سلطنت اودھ کی ضبطی کا منصوبہ بہت پہلے سعادت علی خاں کے دور میں انگریزوں نے مرتب کیا لیکن اس وقت انگریز نسبتاً" زیادہ طاقتور ریاستوں کو ضم کرنے کے درپے تھے لہٰذا انہوں نے اس وقت تعرض کرنا مناسب نہیں سمجھا۔اب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ وقت آگیا ہے کہ شمالی ہند کی اس مسلمان ریاست کو جو تہذیبی اعتبار سے سلطنت مغلیہ کی وارث اور جانشین ہے ختم کر دیا جائے' اودھ کی حکومت جو پہلے ہی انگریزوں کی باجگزار تھی (۵۳) ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو ایک اشتہار کے ذریعہ برطانوی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا اور واجد علی شاہ کو مٹیا برج کلکتہ بھیج دیا گیا:

"اشتہار دیا جاتا ہے کہ آج کے دن سے ملک اودھ کا نظم و نسق بلاشرکت غیرہمیشہ کے لئے کمپنی انگریز بہادر کے قبضہ اختیار میں آگیا ہے۔ سب عامل و ناظم و چکلہ دار و جملہ نوکران دربار اور سب اہل کاران مالی و ملکی' دیوانی و فوجداری و سپاہیان دربار اور جملہ ساکنان اودھ کو لازم ہے کہ آئندہ کمپنی بہادر کے اہل کاروں کی اطاعت اور فرماں برداری کلی کرتے رہیں۔" (۵۴)

اس اعلان نے اس نفرت کی آگ کو جو جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں سلگ رہی تھی' ایک شعلۂ جوالہ میں تبدیل کر دیا۔ اگرچہ وہ اب تک مختلف صورتوں میں انگریز کے خلاف اپنی دلی نفرت کا اظہار عملی تحریکات کی شکل میں موقع بہ موقع کرتے رہے تھے مگر اب پورے ملک کے لوگ انگریزوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

واجد علی شاہ کے دربار کے علاوہ چھوٹے چھوٹے رئیسوں اور تعلقہ داروں کے دربار بھی تھے جن سے شاعروں اور اہل علم حضرات کی پرورش ہوتی تھی۔ حکومت اودھ کے خاتمے کے ساتھ ہی یہ تمام محفلیں بھی آنکھ جھپکتے ہی درہم برہم ہو کر رہ گئیں۔ اس دور کے ایک شاعر میرامان علی سحر (۵۵) نے نواب منور الدولہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کی تشبیب میں انہوں نے لکھنؤ کی تباہی کی تصویر کھینچی ہے۔ ان اشعار سے عوام میں واجد علی شاہ کی مقبولیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

تمام ہند کی تھا جان ' لکھنؤ اپنا
ہمارا خسروِ جم جاہ ' جانِ عالم تھا

جہاں ہے قالبِ بے جاں' کسی میں جان نہیں
فراق موت سے بدتر ہے اس مسیحا کا

اگر ہزار برس کھائے گا فلک گردش
پھر اس صفات کا ہو گا نہ آدمی پیدا

عجیب مجمعِ اہلِ کمال تھا' افسوس
ہزار حیف وہ صحبت فلک نہ دیکھ سکا

نہ پانچوں وقت کی نوبت نہ وردیاں ' نہ گجر
نہ توپ چلتی ہے اب' ہے غضب کا سناٹا

جہاں میں صاحبِ جوہر کی ہے یہ بے قدری
ٹکے ٹکے پہ بکیں اصفہانیاں کیا کیا (۵۶)

چھوٹی چھوٹی ریاستیں جو دراصل عام لوگوں کا ملجا و ماوا تھیں، واجد علی کی معزولی کے بعد ان کا انجام بھی صاف نظر آنے لگا تھا۔

منیر نے جب نواب واجد علی شاہ کی معزولی کی خبر سنی جن سے ان کو بڑی عقیدت تھی اور جن کی مدح میں وہ ایک زوردار قصیدہ لکھ چکے تھے (۵۷) تو وہ بہت دلگیر ہوئے اور ان کے دل میں دوسرے مسلمانوں کی طرح انگریز کے خلاف نفرت اور شدید ہو گئی (۵۸)۔ اس سانحہ کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ میرٹھ سے ہنگامہ کی خبر آئی۔ دیکھتے دیکھتے دہلی اور لکھنؤ اس تحریک کے مرکز بن گئے۔ منیر بھی اس عظیم تحریک انقلاب سے پوری طرح متاثر نظر آتے ہیں انہوں نے نہ صرف ذاتی طور پر اس جنگ آزادی میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا بلکہ فرخ آباد اور باندہ کے امراء کو بھی انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر آمادہ کیا۔ منیر کے دل میں انگریزوں کی چیرہ دستیوں کے خلاف کس قدر نفرت تھی اور ان کو اہل وطن کی بربادی کا کتنا دکھ تھا، اس کا اندازہ ان کے بعض قصائد، قطعات اور غزلوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ دیسی ریاستوں کی بربادی، گوروں کے ظلم و ستم، ملک کی غلامی اور معاشی بدحالی کی درد انگیز تصویریں ان کے کلام میں جابجا محفوظ ہیں۔ یہ تصویریں اس جذبۂ حریت کی غماز ہیں جو منیر کی پہلودار شخصیت کا حصہ تھا۔ منیر شکوہ آبادی نے جس مذہبی فضا میں تربیت پائی تھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ اس جنگ آزادی کو کفر و دیں کی پنجہ آزمائی سمجھیں۔ اس طرح ذہنی اعتبار سے ان کی فکر کا تعلق اس تحریک سے جا ملتا ہے جو اسلامیان ہند کی تاریخ میں تحریکِ جہاد کے نام سے موسوم ہے جس کے موسس اول شاہ ولی اللہؒ اور جس کو آگے بڑھانے والے شاہ عبدالعزیزؒ، سید احمد شہید بریلوی اور سید اسماعیل شہید تھے۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے جنگ آزادی ۱۸۵۷ صرف فوجیوں کی بغاوت نہ تھی بلکہ یہ اس جدوجہد کا نقطۂ عروج تھی جو گزشتہ کئی سو برس سے حفظ ناموس دین کے لئے جاری تھی۔ سید احمد شہید کی وفات کے بعد بھی یہ تحریک ختم نہیں ہوئی۔ وہ آگ جو ان جاں فروشوں نے روشن کی تھی، وقتی طور پر حالات کی راکھ میں دب ضرور گئی مگر اس چنگاری میں یہ صلاحیت ضرور موجود تھی کہ ذرا سی ہوا چلے تو بھڑک کر شعلہ بن جائے۔ سید احمدؒ کے جانشینوں میں عنایت علی اور ولایت علی کے نام لئے جاسکتے ہیں جنھوں نے اس تحریک کو زندہ رکھا۔ ۱۸۴۷ء میں ان کو پنجاب بدر کر دیا گیا اور

پٹنہ میں قیام کا پابند بنا کر ان سے اس امر کی ضمانت بھی لی گئی کہ وہ اپنے طور طریقے "ٹھیک" رکھیں گے مگر ۱۸۵۰ء میں ضلع راجشاہی میں ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ الزام یہ تھا کہ یہ وہاں لوگوں کو بغاوت پر اکسا رہے تھے۔ اس جرم میں ان کو دوبار ضلع بدر کیا گیا مگر ۱۸۵۲ء میں وہ پھر پنجاب کی سرحد پر "باغیانہ" سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے (۵۹)۔ اسی زمانہ میں پٹنہ کے انگریز مجسٹریٹ نے حکومت کو اطلاع دی۔

"باغی گروہ شہر میں زور پکڑتا جارہا ہے۔ یہاں کے اصل باشندے اب بغاوت کی تلقین علی الاعلان کر رہے ہیں۔ پولیس کی ہمدردیاں بھی ان سرپھروں کے ساتھ ہیں۔ ان کے لیڈر مولوی احمد اللہ نے سات سو افراد کو اپنے مکان میں اکٹھا کیا اور اعلان کیا کہ اگر مجسٹریٹ نے اپنی تحقیقات کو آگے بڑھایا تو اس کا جواب پوری طاقت سے دیا جائے گا۔" (۶۰)

ایسے ہی مبلغین میں فیض آباد کے مولوی احمد شاہ تھے جو عام مسلمانوں کے خیالات کو ایک خاص راہ پر لگا رہے تھے۔ مولوی احمد شاہ کو ایک ہندو مورخ اس طرح خراج تحسین پیش کرتا ہے۔

"وہ جذبات کے سمندر میں اسی طرح تموج کا سبب تھا' جیسے پورا چاند پانیوں میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔ شمال مغربی صوبوں' اودھ اور روہیل کھنڈ وہ جہاں بھی جاتا' لوگوں سے خطاب کرتا۔ اس کی باتیں سن کر' مسلمان اپنے اندر ایک توانائی محسوس کرتے۔ وہ لوگ گھرے سیاہ بادلوں میں بغیر برسی ہوئی بارش کی مانند تھے جو زمین پر پھٹ پڑنے کے موقع کی تلاش میں ہو۔" (۶۱)

یہ چند معروضات ان جذبات تک رسائی کی ایک کوشش ہیں جن سے برصغیر میں بسنے والے اس خاص عہد کے مسلمان دوچار تھے۔ مسلمان حکومت اور عزت سے محروم کر دیئے گئے تھے۔ لے دے کے ان کے لئے صرف دین ہی ایک سہارا رہ گیا تھا جو اس عہد نارساں میں ان کی تسکین کا سبب بن سکتا تھا مگر انگریز اپنی زمین کی بھوک کو مٹانے کے ساتھ ساتھ برصغیر میں عیسائیت کا فروغ بھی چاہتے تھے اور اس سلسلہ میں ہر کوشش ان کے خیال میں روا تھی۔ مسٹر مینگل نے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین تھے' واشگاف لفظوں میں برطانوی دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"خدا نے انگلستان کو ہند کی وسیع مملکت اس لئے سونپی ہے کہ یسوع مسیح کا پرچم فاتحانہ انداز میں اس سرزمین کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لہرائے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ پوری قوت سے بغیر کسی تاخیر کے تمام ہندوستان کے رہنے والوں کو عیسائی بنانے کا عظیم کام سرانجام دے۔" (۶۲)

۱۸۵۶ء میں عیسائی مشنریوں نے اپنا منشور شائع کیا جس میں اس امر پر مسرت کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہند میں ریل اور دخانی جہازوں کی سہولت نے تمام نسلوں کے انسانوں کو مادی طور پر اکٹھا کر دیا ہے۔ ان کا یہ اجتماع بالواسطہ ان کو ایک عقیدہ کے تحت لانے کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ سرسید احمد خاں "رسالہ اسباب بغاوت ہند" میں انگریز پادریوں اور مشنریوں کی حکومت کی شہ پر دین میں علی الاعلان مداخلت کو "بغاوت" کا ایک بنیادی سبب قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ۱۸۳۷ء کی شدید قحط سالی کے موقع پر انگریزوں کا یتیم بچوں کی پرورش کرنا اور ان کو عیسائی بنانا ایک ایسا اقدام تھا جو شمال مغربی صوبوں کے مسلمانوں کے دلوں میں انگریز کے خلاف سخت نفرت پیدا کرنے کا موجب ہوا۔ (۶۳)

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں یوں تو برصغیر کے مختلف طبقے وقتی طور پر اکٹھے ہوگئے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ مسلمانوں ہی نے لڑی۔ برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حاکم، ملازم، انگریز تاجر اور ان کے ہندو دلال جو گزشتہ ایک صدی سے مظالم توڑ رہے تھے ان کا نشانہ یہاں کے مسلمان ہی تھے۔ ان مسلمانوں میں امیر، غریب، نواب، کاریگر غرض ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ انگریز اور ہندو بنیوں میں اشتراک عمل کی بنیاد وہ نفرت تھی جو ان کے دلوں میں برصغیر کی اسلامی حکومت کے خلاف موجود تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مشترکہ کوششوں کے ذریعہ اس مسلمان طبقہ کو ختم کر دیا جائے جو سینکڑوں برس سے یہاں حکومت کر رہا تھا۔ مسلمانوں میں اس کا ردعمل ضروری تھا، چنانچہ ان میں مذہب کی اساس پر اصلاحی و اجتماعی تحریکیں پیدا ہوئیں جنھوں نے آگے چل کر سیاسی شکل اختیار کرلی۔ ان تحریکوں میں عام مسلمان پیش پیش تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی بھی اسی قسم کی ایک عوامی تحریک تھی جس میں ان مسلمانوں نے جن میں صحیح معنوں میں اسلامی و سیاسی شعور تھا، بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ منیر بھی یقیناً" ایسے ہی لوگوں میں شامل تھے، اسی لئے منیر شکوہ آبادی نے ان جاں نثاروں کو جو اس جدوجہد میں کام آئے "شہید راہ حق" کے معتبر

نام سے یاد کیا ہے۔

منیر کے دل میں انگریز کے خلاف نفرت کا جذبہ سن شعور ہی سے موجود تھا۔ ان کے دور اول کی ایک مشہور غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے تشبیہ و استعارہ کے پردے میں، اپنے دل کی کیفیت کو کھول کر رکھ دیا ہے، کہتے ہیں۔

تارے ہوئے غروب، خط و خال دیکھ کر
گوروں کے پاؤں اٹھ گئے، کالوں کے سامنے (۶۴)

بندیل کھنڈ کے علاقہ میں جھانسی کو بڑی اہمیت حاصل تھی یہاں پہلے سے بے چینی موجود تھی کیونکہ راجہ گنگا دھر لاولد مر گیا تو لارڈ ڈلہوزی نے اس کی وفاداریوں اور وصیت کا خیال کئے بغیر اس کے متبنٰی رامودر راؤ کو حق وراثت سے محروم کر کے جھانسی کا جبری الحاق کر لیا۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ کو جب جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو اس کے چند روز بعد یعنی ۴ جون کو جھانسی کی رانی لکشمی بائی بھی انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو گئی (۶۵)۔ نواب علی بہادر ایک جری اور شجاع شخص تھے، ان کو امرائے بندیل کھنڈ میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ باندہ کی ریاست کے قرب وجوار میں رونما ہونے والے واقعات اور مہارانی لکشمی بائی کی شجاعت کے کارناموں نے ان کو بھی بے چین کر دیا۔ ساتھ ہی رانی جھانسی اور تانتیا ٹوپی کے نامہ و پیام نواب علی بہادر کے نام اس جنگ آزادی میں شرکت کے لئے برابر آجا رہے تھے۔ نواب علی بہادر نے مرزا ولایت حسین خاں وزیراعظم باندہ اور منشی سید اسماعیل حسین منیر سے رائے طلب کی۔ یہ دونوں بھی جاں بازی اور سرفروشی کے لئے تیار ہو گئے۔ اس وقت تک نواب کو عنان حکومت سنبھالے بمشکل آٹھ برس ہوئے تھے مگر ان کے حسن انتظام کے سبب ریاست میں فوج کی تعداد بھی معقول تھی اور خزانہ بھی معمور تھا۔ اس کے ساتھ ہی ضروری سامان حرب و ضرب، رسد وغیرہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ ۱۵ جون ۱۸۵۷ء (۲۲ شوال ۱۲۷۳ھ) کو قلعہ باندہ میں مقیم انگریز عہدہ دار مسٹر ایچ اے کاک ویل کو نواب علی بہادر کے غضب ناک مصاحبین نے قتل کر دیا۔ یہ گویا انگریز دشمنی کا اولین مظاہرہ تھا جو باندہ کی سرزمین پر رونما ہوا۔ ۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء (۱۸ صفر ۱۲۷۴ھ) کو مجاہدین بھی آگئے اور یوں انگریزوں کے ساتھ معرکہ آرائی کا آغاز ہوا۔ اس موقع پر نواب علی بہادر نے ایک جنگی کونسل تشکیل دی جس کے ارکان میں محمد سردار خان ناظم،

میر انشاء اللہ سپہ سالار، مرزا ولایت حسین وزیراعظم، امداد حسین اور فرحت علی شامل تھے۔ موخرالذکر دو اصحاب باندہ کی فوج میں اعلی افسر تھے۔ کاک ویل کا بدلہ لینے کے لئے انگریز افواج میجر جنرل وائٹ لاک کی سرکردگی میں باندہ پر حملہ آور ہوئیں مگر ان کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ادھر نواب علی بہادر برابر گردوپیش کے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کا خیال یہی تھی کہ اردگرد کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اپنے دائرۂ اختیار میں لے کر اپنی طاقت بڑھائی جائے۔ چنانچہ نواب علی بہادر نے کیل کانٹے سے لیس ہو کر راج گڑھ کے قلعہ پر حملہ کیا اور اس کو باآسانی فتح کر لیا۔ اس دوران اجے گڑھ کا سردار بوندیلہ مسمی رن جوردوا جو انگریزوں کا حلیف تھا، باندہ پر حملہ آور ہوا مگر نواب علی بہادر کی شجاعت کے سامنے اس کی ایک پیش نہ گئی اور اس کو بری طرح شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا۔ اس فتح کے موقع پر منیر نے متعدد قطعات تہنیت فتح نواب علی بہادر جنگ بہ دوا بندیلہ لکھے۔

چو فوجِ بندیلہ، بباندہ رسید
زحصنِ اجے گڑھ برائے فساد

بر ایشاں ظفر یافت نوّابِ ما
دلِ اہلِ انصاف گردید شاد

چنیں گفت تاریخِ نصرت، منیر
خدا فتحِ عالی بہ نوّاب داد (۶۶)

اس لڑائی میں بہت سا سامان جنگ نواب علی بہادر کے ہاتھ لگا جس میں کئی توپیں بھی شامل تھیں، منیر نے اس واقعہ کی تاریخ نظم کی۔

رستمِ دیں، علی بہادر نے
جو ہیں نامِ خدا مسمی علی

مار کر لشکرِ اجے گڑھ کو
توپیں چھینیں بہ ہمّتِ ازلی

خوب پائی منیر نے تاریخ

توپ یہ جنگ فتح کرکے لی (۶۷)

سردار بوندیلہ شکست کھا کر قلعہ بند ہو گیا۔ نواب علی بہادر کے سپاہیوں نے بڑھ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ واقعہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء (۱۸ صفر ۱۲۷۴ھ) کا ہے۔ رسد پانی اور اسلحہ کی کمی کی وجہ سے تین ہفتہ کے بعد اہل قلعہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ سردار بوندیلہ کے علاوہ اس کی فوج کے دو بڑے سربراہ اسیر کرکے باندہ لائے گئے جہاں ان کو نواب کے قلعہ میں محبوس کر دیا گیا۔ یہ موقع عام اظہار مسرت کا تھا۔ منیر نے قطعہ تہنیت کہا۔ اس موقع پر ان کا لہجہ بڑا ہی تمسخر آمیز ہے۔ کہتے ہیں۔

ہوا محبوس دوا باندے میں آکر اجے گڑھ سے

پھنسا دامِ مصیبت میں سیانا گرچہ کوّا ہے

نہ تھی مقدار کچھ اس کی نگاہِ اہلِ بینش میں

جو کودک طبع تھے وہ اس کو کہتے تھے کہ حوّا ہے

بوندیلے جانتے تھے سرخرو اس کو شجاعوں میں

وفورِ خوف سے اب رنگ زرد اس کا امّوا ہے

خدا دے پستہ و بادام کیوں کر اس کے کھانے کو

مقدر میں ازل سے جس کے تیندو اور مہوّا ہے

منیر اس کی اسیری کی کہی تاریخ یہ میں نے

اسیرِ مرگ، مجبورِ ابد رن جور دوّا ہے (۶۸)

قطعات تاریخ کے علاوہ اس پُرمسرت موقع پر منیر نے ایک قطعہ تہنیت بھی موزوں کیا جس سے منیر کے فن اور قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔

فتح دی اپنی عنایت سے خدا نے آپ کو

سب عدو مقتولِ تیغ و بستۂ زنجیر ہیں

آیہٴ انا فتحنا مژدہٴ فتحؔ قریب
تہنیت سے ہم زباں وردِ لبِ تقریر ہیں
کیوں نہو فضلِ خدا' چشمِ عنایاتِ رسول
آپ ہم نامِ جنابِ شاہِ خیبر گیر ہیں
فتحِ زیبا و مبارک ہو' مٹا خارِ خلش
آپ منظورِ نگاہِ مالکِ تقدیر ہیں
لا فتیٰ' الا علیٰ' لا سیف الا ذوالفقار
صورتِ نصرٌ من اللہ ' جوہرِ شمشیر ہیں (۶۹)

اجے گڑھ کے معرکہ میں منیر کے ایک رفیق کار کو جن کا نام غلام حیدر خاں تھا' شدید زخم آئے۔ نواب علی بہادر ان کی طرف سے بڑے فکر مند رہے۔ بالآخر طبیب خاص کے علاج سے صحت یاب ہوئے۔ منیر نے اس طرح خوشی کا اظہار کیا۔

ہوئے زخمی غلام حیدر خاں
فکر نوّاب کو عجیب ہوئی
فضلِ خالق سے ہو گئی صحت
کارگر محنتِ طبیب ہوئی
کہی فوراً" منیر نے تاریخ
اب شفا زخم سے نصیب ہوئی (۷۰)

اسیر مرگ رن جور دوا چھ ماہ تک قلعہ میں قید رہا۔ یہاں تک کہ اپریل ۱۸۵۸ء (رمضان ۱۲۷۴ھ) میں انگریزوں نے باندہ کو فتح کر لیا تو نواب کے ہارے ہوئے سپاہیوں نے انتقاما" ان اسیروں کو قید مکانی کے ساتھ قید زمانی سے بھی آزاد کر دیا۔ (۷۱)

اپریل ۱۸۵۸ء(شعبان ۱۲۷۴ھ) کے اوائل میں میجر جنرل وائٹ لاک ایک بڑی جمعیت کے ساتھ باندہ کی طرف بڑھا۔ نواب علی بہادر نے اپنی فوج کے کچھ دستوں کو مہوبہ کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ انگریز فوج کی پیش قدمی کو روک سکیں۔ نواب علی بہادر نے کالنجر سے اپنے سپاہیوں کو بھی

واپس بلا لیا تاکہ وہ باندہ کے قریب انگریز حملہ آوروں کی مدافعت کریں۔ یہاں مجاہدین اور انگریزی فوج کے ساتھ ایک زور دار معرکہ ہوا جس میں انگریزوں کا پلّہ بھاری رہا۔ اپریل ۱۸۵۸ء کے وسط (رمضان ۱۲۷۴ھ) میں نواب علی بہادر اپنی تمام فوج کو میدان جنگ میں لے آئے اور خود اس فوج کی کمان سنبھال لی۔ نواب کے سپاہیوں نے باندہ سے آٹھ میل مغرب میں گورا مغلی کے قریب مورچہ بندی کر لی۔ جغرافیائی حالات بھی اس مدافعتی جنگ کے لئے باندہ کی فوج کے حق میں تھے کیونکہ اس علاقہ میں اونچے ٹیلے اور گہری کھائیاں بہت تھیں۔ ۱۹ اپریل ۱۸۵۸ء (۵ رمضان ۱۲۷۴ھ) کو زبردست معرکہ ہوا جس میں جنرل وائٹ لاک کی فوج کا مگار ہوئی اور نواب علی بہادر کے آٹھ سو سپاہی کھیت رہے۔ بہت سا جنگی سامان انگریزوں کے ہاتھ لگا جس میں آٹھ توپیں بھی تھیں۔ (۷۲) معرکۂ باندہ میں فتح کے نشہ میں چور، انگریزوں نے جن لوگوں کو انتقاماً" موت کی سزا دی ان میں منشی منیر کے نہایت عزیز دوست مرزا عباس بیگ نادر (۷۳) بھی شامل تھے۔ منیر نے ان کی شہادت کی تاریخیں کہی ہیں۔

گئے جہان سے عباس بیگ نادر آہ
بریلی کے متوطن، سخن رس و شاعر
کمال فارسی و انگریزی و اردو
عروض و قافیہ و فنِّ شعر کے ماہر
ندیم نادرِ شاہی کے تھے یہ ابن الابن
یہی تھی وجہ وجیہِ تخلصِ نادر
سنا نہیں ہے کوئی دوست اسقدر خالص
طبیعت ان کی تھی یک رنگ باطن و ظاہر
وہی ثبات وہی صبر تھا، وہی تھے حواس
وہی نظر، وہی تیور تھے تا دمِ آخر
نہا کے آبِ دمِ تیغِ مرگ سے افسوس
ریاضِ خلد میں جا پہنچے طیب و طاہر
منیر ہاتفِ غیبی نے یوں کہی تاریخ
ہوا شہید بہ حیف آج شاعرِ نادر (۷۴)

نواب علی بہادر شکست کے بعد جھانسی کی رانی اور راؤ پیشوا سے، اس امید پر کہ ان کا ساتھ دے کر انگریزوں سے اس شکست کا بدلہ لیا جا سکتا ہے کانپی کے مقام پر جاملے اور منیر نے فرخ آباد کا رخ کیا جہاں ان کے دوست شاگرد اور بعض افراد موجود تھے۔ علاوہ ازیں نواب تفضل حسین ان کے قدیم بہی خواہ اور سرپرست بھی وہاں تھے جو جنگ آزادی میں مجاہدین کے ساتھ تھے۔ منیر کو یہ بھی خیال تھا کہ ان سے بھی انگریزوں کے خلاف نواب علی بہادر کے حق میں کچھ مدد ضرور لی جا سکتی ہے۔ ہرچند منیر کو اپنی اس کوشش میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی لیکن یہ بھی کیا کم تھا کہ وہ نو دس مہینے تک (۸ جنوری ۱۸۵۹ء تا ۳۱ اکتوبر ۱۸۵۹ء مطابق ۳ جمادی الثانی ۱۲۷۵ھ تا ۴ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ) انگریزوں کی دست برد سے محفوظ رہے جو لارڈ کلائڈ کے منصوبے کے تحت ہر لمحہ اپنا جال تنگ سے تنگ تر کرتے جا رہے تھے، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ یا تو ان کے دشمن خود کو ان کے حوالے کر دیں یا پھر وہ نیپال کی طرف نکل جائیں جہاں کا حاکم جنگ بہادر انگریزوں کا حلیف اور وفادار تھا۔(۷۵)

فرخ آباد کے مسلمان کس بے جگری سے انگریزی فوج سے نبرد آزما ہوئے، یہ جاننے کے لئے صرف ایک واقعہ کا بیان کرنا کافی ہوگا۔ ۱۹ جون ۱۸۵۷ء (۲۶ شوال ۱۲۷۳ھ) کو جب اکتالیسویں سیتا پور رجمنٹ دریا پار کر آئی تو نواب تفضل حسین نے اس کی ہر طرح اعانت کی۔ انگریز فوج کا پہلا معرکہ احمد یار جان ناظم اور محسن علی خان کے ساتھ فتح گڑھ کے مقام پر ہوا جس میں بہت سے انگریز کام آئے۔ فتح گڑھ کے بعد فرخ آباد کے قلعہ پر انگریزی فوج سے مقابلہ ہوا لیکن اپنوں کی غدّاریوں کی وجہ سے شکست ہوئی (۷۶)۔ سب لوگ ادھر ادھر چلے گئے مگر ناصر خاں نے جو اس معرکہ میں شریک تھے شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ناصر خاں فرخ آباد کے قرب وجوار میں جو توپیں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں، ان کو تنہا گھسیٹ کر لے گئے اور قادری دروازے کے برج پر لگا دیں۔ جب انگریز فوجیں ان کے سامنے آتیں تو یہ بیک وقت توپیں چلاتے۔ جب کافی دیر لڑتے لڑتے گزر گئی اور انگریزی فوج بار بار پسپا ہوتی رہی تو ایک انگریز افسر نے دوربین لگا کر دیکھا تو بڑا حیران ہوا کہ ایک ہی آدمی تن تنہا لڑ رہا ہے - ایک روایت یہ ہے کہ نشانہ لگاتے ہوئے توپ کی چرخی آپ کے پاؤں پر گر گئی جس کی وجہ سے بے بس ہو گئے۔ جب کافی دیر تک گولہ نہیں

آیا تو انگریزی فوج قلعہ کے اندر گھس گئی- دوسری روایت یہ ہے کہ جس وقت یہ گولہ باری کر رہے تھے' مخبروں نے قادری دروازہ کھول دیا اور فوج اندر آگئی- سپاہی برج پر پہنچے' ان کو گرفتار کیا اور پھانسی پر چڑھا دیا- ناصر خاں انتہائی جری آدمی تھے ' ان کا اس وقت تک دم نہیں نکلا جب تک ٹخنے کی نس نہیں کاٹی گئی-(۷۷)

" بالآخر ۷ جنوری ۱۸۵۹ء (۲ جمادی الثانی ۱۲۷۵ھ) کو میجر بیرو (BARROW) اسپیشل کمشنر کی اس یقین دہانی پر کہ ان کو موت کی سزا نہیں دی جائے گی نواب تفضل حسین خاں اور بعض دوسرے سرداروں نے اچانک ہتھیار ڈال دیئے- یہ واقعہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ رسل جو وہاں موجود تھا اپنے روزنامچے میں اس صورت حال پر سخت حیرت کا اظہار کرتا ہے- وہ لکھتا ہے-

" سات تاریخ کی صبح کو اس سے پہلے کہ ہم کوچ کریں' نواب فرخ آباد نے اپنے پیروکاروں کے ساتھ رپتی ندی کو پار کیا اور خود کو میجر بیرو کے سپرد کر دیا- مہدی حسن اور بعض دوسرے باغی سرداروں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے- یہ منظر انتہائی دلچسپ تھا کیونکہ یہ لوگ بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے- وہ قطعی پریشان نظر نہیں آرہے تھے - یہ وہ افراد تھے جو چند گھنٹے پیشتر ہمارے ساتھ برسرپیکار تھے اور اب 'بڑے آرام سے اسپیشل کمشنر کے خیمہ میں متمکن تھے-" (۷۸)

نواب تفضل حسین خاں پر مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا تجویز ہوئی کیونکہ انگریزوں کے خیال میں ان کے ہاتھوں بعض یورپین مارے گئے تھے لیکن میجر بیرو چونکہ ان کی جاں بخشی کا وعدہ کر چکا تھا اس لئے انگریزوں نے نواب فرخ آباد کے لئے یہ سزا تجویز کی کہ ان کو جلا وطن کر دیا جائے- نواب تفضل حسین خاں سرزمین عرب کو ہجرت کر گئے اور ریاست فرخ آباد ضبط کر لی گئی' لیکن انگریزوں کے جذبۂ انتقام سے فرخ آباد کے دوسرے امراء نہ بچ سکے جن میں نواب تفضل حسین خاں کے چھوٹے بھائی نواب سخاوت حسین خاں بھی شامل تھے- نواب سخاوت حسین خاں کو فتح گڑھ کے قلعہ میں املی کے درخت پر پھانسی دی گئی- منیر نے تاریخ کہی-

ریاضِ خلق' سخاوت حسین خاں نوّاب
نہالِ باغِ کرم ' زیبِ مسندِ شوکت

جوان، قابل و فرزندِ خاصِ نصرت جنگ
غلامِ آلِ نبی ، سرورِ قمر طلعت
سخاوت اور مروت میں بے نظیرِ جہاں
ریاست اور امارت کے واسطے زینت
ہر ایک دل میں جگہ اس کی جان سے بڑھ کر
ہر اک زبان پر اس کا وظیفۂ مدحت
زمانہ اس کی مروت پر اس طرح شیدا
مشامِ روح ہو جس طرح عاشقِ نکہت
وہ بے گناہ ہوا تیغِ مرگ سے مقتول
عنایت اس کو کیا حق نے گلشنِ جنت
منیر نے یہ کہی اس کے قتل کی تاریخ
ہوا شہید امیرِ دلیر، با ہمت (۷۹)

دوسرے رؤسا جو انگریزوں کے غیض وغضب کا نشانہ بنے، ان میں نواب اقبال مند خاں اور نواب غضنفر حسین خاں منیر کے مربّی تھے۔ نواب اقبال مند خاں کے بدن پر پھانسی دینے سے پہلے سؤر کی چربی ملی گئی اور پھر ان کو فرخ آباد میں گورنمنٹ سکول میں ہلاک کیا گیا جبکہ نواب غضنفر حسین خاں کو گھومنی کے درخت پر پھانسی دی گئی (۸۰)۔ دونوں رؤساکی شہادت کی مشترکہ تاریخ منیر نے لکھی۔

اقبال مند خاں و غضنفر حسین خاں
دونوں درِ محیطِ عطا، آہ آہ ہائے
دونوں جوان نیک، امیرانِ ذی حشم
مقتولِ تیغِ تیزِ قضا، آہ آہ ہائے
تاریخ ان کے قتل کی کافی ہے یہ منیر
دونوں شہیدِ راہِ خدا، آہ آہ ہائے (۸۱)

اب منیر کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ رہا کہ وہ روپوش ہو جائیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

ان ہی ایام یعنی ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء - ۱۸۵۸ء) میں منیر شکوہ آبادی نے ایک لامیہ قصیدہ موسوم بہ "درِ نجف" تصنیف کیا- اس قصیدے کے بعض شعروں سے ان دنوں ان کی پریشانی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے-

اس زمانے میں کہا ہے یہ قصیدہ میں نے
کہ مصائب میں گرفتار ہیں ' اعلیٰ اسفل
روز ہوتا ہوں نئے شخص کے گھر میں روپوش
آج پھانسی کی خبر ہے تو اسیری کی کل
لنگ ہے سترِ بدن' فرش ہے اک کہنہ حصیر
جان و عزت کے تردد کے مصیبت پہ بل
اس قصیدے کے صلہ میں مجھے دے اطمینان
تیرے روضہ میں کروں طاعتِ معبودِ اجل (۸۲)

منیر نے اپنے قصیدے کے ان شعروں میں اپنی پریشانی' خوف مرگ اور عسرت کی جو تصویر کھینچی ہے اس کی تصدیق سید افضل حسین ثابت کی تحریر سے بھی ہوتی ہے- ثابت نے ایک فرخ آبادی بزرگ کا بیان "دربار حسین" میں درج کیا ہے - وہ لکھتے ہیں-

"ایک میرے بزرگ جو نواح فرخ آباد کے رہنے والے ہیں' بیان فرماتے ہیں کہ ایک رات کو ایک قد آور فقیر آیا جو ایک تہمد (تہہ بند) لگائے- میلا کچیلا کرتا پہنے ہوئے تھا- اس نے نہ دست سوال دراز کیا' نہ منہ سے کچھ بولا- تصویر کی طرح خاموش دیر تک گردن جھکائے کھڑا رہا- زبان حال سے گویا میر مرحوم کا یہ شعر پڑھتا تھا-

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے ' سرہانے دھرے دھرے

والد مرحوم نے پوچھا- بھئی تم کیا چاہتے ہو' جب بھی اس نے کچھ جواب نہ دیا- والد مرحوم نے نوکروں کو کسی بہانہ سے وہاں سے باہر بھیج دیا اور اس فقیر سے کہا- میر

صاحب! میں نے آپ کو پہچان لیا مگر افسوس میں آپ کو چھپا نہیں سکتا۔ اگر مجھے کچھ نقصان پہنچے اور آپ بچ جائیں جب بھی مضائقہ نہیں مگر افسوس کہ آپ کا اشتہار گرفتاری جاری ہے' آپ ضرور گرفتار ہو جائیں گے۔ یہ کہہ کر کچھ ان کی خفیہ خدمت کی۔ نہ معلوم کتنی اشرفیاں دیں۔ وہ صاحب چلے گئے۔ دو چار دن کے بعد مجھ سے والد صاحب نے فرمایا کہ بیٹا تم نے ان فقیر کو نہیں پہچانا' وہ سید منیر تھے۔" (۸۳)

ان ایام میں منیر نے جو غزلیں کہیں' ان میں شدائد حیات کے تذکرہ کے ساتھ ایک خواہش مرگ موجود ہے تاکہ وہ شب و روز کے اس عذاب مسلسل سے رہائی پا سکیں۔ غزل کے پیرایہ میں انقلاب زمانہ اور اپنوں کے غیر بن جانے کا ماتم انہوں نے بہت موثر انداز میں کیا ہے۔ ایک غزل کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جو ان کی ذہنی حالت کا آئینہ ہیں۔

مرا دل جلاتے جو کپڑے بدل کر
یہ اسپند لیتا بلائیں اچھل کر
پہن کر کفن جاؤں شہرِ عدم میں
ملوں اپنے یاروں سے کپڑے بدل کر
نہ پہنچا اثر تک' نہ گوشِ بتاں میں
بھٹکتا پھرا منہ سے نالہ نکل کر
ملیں کس سے اے انقلابِ فلک ہم
ہوا اجنبی سب زمانہ بدل کر
اُدھر تو محل میں کوئی بولتا ہے
اِدھر جھانکتا ہے کلیجہ اچھل کر
مٹا دے نوشتہ کتابِ عمل کا
الٰہی ورق سے ورق ہاتھ مل کر

نہ چونکیں گے محشر میں بھی بختِ خفتہ
نہ دے چھینٹے اے خونِ حسرت ابل کر
منیر ان دنوں مضطرب یا علی ہے
خدا کے لئے مشکلِ سخت، حل کر (۸۴)

ان ہی دنوں انھوں نے ایک غزل کہی جس کے مقطع میں تاریخ تصنیف ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ - ۱۸۵۸ء) موجود ہے۔ اس غزل کی ردیف "لنگ و بوریا" ہے۔ یہ غزل ان حالات میں منیر کی خاص ذہنی کیفیت کا آئینہ ہے۔

ہوتے نہیں ہیں مجھ سے جدا ، لنگ و بوریا
دیتے ہیں خوب ساتھ مرا، لنگ و بوریا
لپٹا ہے یہ کمر سے ، وہ رہتا ہے پائے بوس
ہارے ہیں مجھ سے شرطِ وفا ، لنگ و بوریا
دونوں ہیں میرے گوشۂ عزلت میں پردہ دار
اک اصل سے بُنے گئے کیا، لنگ و بوریا
گزرے کئی ہزار کے اسباب و مال سے
اس وقت ہاتھ آئے ہیں کیا لنگ و بوریا
دشمن ترے کڑھیں مری حالت پہ اے پری
ہونے دے ہیں جو رنج فزا لنگ و بوریا
تاریخ ان کے وصف کی سن لے منیر سے
کافی ہے زادِ راہِ خدا ، لنگ و بوریا (۸۵)

منیر ان ایام میں حالات کی چیرہ دستی سے بہت زیادہ نڈھال رہتے تھے۔ ایک مایوسی تھی کہ دامن دل چھوڑنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اگر اس مرحلہ پر ان کا عقیدہ جس کو بمنزلہ نظریۂ حیات کا درجہ حاصل تھا، آڑے نہ آتا تو وہ کب کے راہ عدم کی گرد ہو چکے ہوتے، وہ عین مایوسی کے عالم میں بھی مایوس نہیں ہوتے۔ ان کو یقین تھا کہ حضرت مہدی آخرالزمان، ان کی ضرور مدد فرمائیں گے

اور یہ پریشانیوں اور مایوسیوں کی کیفیت جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ "صاحب الامر علیہ السلام" سے طلب استمداد کے انداز دیکھئے۔

مولا ترا فقیر' منیرِ حقیر ہے
بھر اپنے دستِ فیض سے کاسہ سوال کا
بے رنجِ انتظار' مرادیں مری ملیں
آئینہ تیرے سامنے ہے میرے حال کا
مولا مرے' مجھے نہیں اب تاب صبر کی
کوہِ گراں اٹھا مرے دل سے ملال کا
تاریخ اس قصیدے کی تصنیف کی سنو
قائم ہے وصفِ پاک ' شہِ بے مثال کا (۸٦)

منیر بھیس بدلے' ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے۔ فرخ آباد کی زمین ان کیلئے تنگ ہو گئی تھی۔

اپنے آقا کی ہر گھڑی یاد میں ہوں
ہر وقت منیر آہ و فریاد میں ہوں
اس شہر کے نام میں ہے تشدیدِ بلا
آرے کے تلے میں فرخ آباد میں ہوں (۸۷)

ان ہی دنوں میں باقر حسین خاں نے ایک بیاض اشعار مرتب کی اور ساتھ ہی منیر سے قطعہ تاریخ لکھنے کی فرمائش بھی کی۔ عام حالات ہوتے تو کوئی بات نہ تھی مگر ان گوناگوں پریشانیوں کے سبب شعروسخن کی طرف طبیعت کو بہ جبر مائل کرنا پڑتا تھا۔ اگرچہ انہوں نے باقر حسین خاں کی فرمائش کی تکمیل دو قطعات کہہ کر کر دی مگر ساتھ ہی وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔

میں کیا کہوں کہ رنج و بلا میں ہوں مبتلا
فکرِ سخن دماغ سے کوسوں بعید ہے (۸۸)

پریشانی کے ان دنوں میں چند دوست دلی ایسے ضرور تھے' جن کا ہونا ایک طرح سے منیر کے لئے

تقویت قلب کا سبب تھا- ان دوستوں اور شاگردوں میں واجد علی خاں رضواں اور مادھورام جوہر کے نام لئے جا سکتے ہیں جن کی صحبت میں منیر کے افسردہ دل میں زندگی کی حرارت پیدا ہوتی اور عمر گزشتہ کی محرومیاں وقتی طور پر مٹتی ہوئی سی محسوس ہونے لگتیں- غیر یقینی حالات کے سبب غالباً" جوہر اور رضواں بھی منیر کو تا دیر اپنی پناہ میں نہیں رکھ سکتے تھے- ان دنوں منیر نے ایک طویل غزل کہی جس میں اپنی محرومیوں کے دکھ' ترک وطن کے بعد پیش آنے والی صعوبتوں اور اپنی دربدری کو غزل کے لطیف اشاروں میں بہت مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے- اس غزل کے کچھ منتخب اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں-

اک روز بھی نہ کوچے میں اس کے' گزر ہوا
سو مرتبہ زمانہ اِدھر کا' اُدھر ہوا

صدمے سے پختہ مغز وطن چھوڑ دیتے ہیں
پتھر ثمر کے واسطے زادِ سفر ہوا

ہر روز ٹانکے ٹوٹتے ہیں اضطراب سے
کس درجہ تنگ جامۂ زخمِ جگر ہوا

جب بیٹھتا ہوں تھک کے اٹھاتی ہیں ٹھوکریں
میں نقشِ پا ہوا' کوئی گردِ سفر ہوا

اک دوست وقتِ بد میں نہ مجھ کو چھپا سکا
میں خانماں خراب خوشی کی خبر ہوا

ابنائے دہر سمجھے ہیں ناموس' ننگ کو
ہر عیب نور چشمِ کمال و ہنر ہوا

لطفِ کلامِ جوہر و رضواں سے اے منیر
شوقِ فسردہ ہمدمِ برق و شرر ہوا (۸۹)

انگریز کے باغی کو کون پناہ دیتا' آخر کار اکتوبر ۱۸۵۹ء مطابق ربیع الاول ۱۲۷۶ھ میں منیر کی گرفتاری عمل میں آئی- فرخ آباد کے کوتوال نے ان کو گرفتار کر کے ایک اور ملزم کے ہمراہ ۳۱ اکتوبر کو سکھ

سپاہیوں کے ایک دستہ کی نگرانی میں بہلی میں سوار کراکے باندہ روانہ کیا تاکہ وہاں مناسب تحقیقات اور شہادتوں کے بعد کچھ فیصلہ کیا جا سکے- ہفتہ وار کوہ نور لاہور کی ۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء (۱۹ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ) کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی-

"سید محمد اسماعیل (خاں) معروف بہ منشی ملازم نواب باندہ، بجرم بغاوت کے معرفت کوتوال فرخ آباد گرفتار ہو کر صاحب مجسٹریٹ کی خدمت میں روانہ ہوا اور وہاں سے ۳۱ اکتوبر کو بہ سواری بہلی مع ایک آدمی بحراست سپاہیان سکھ کے روانہ ہوا، باندہ میں تحقیقات جرم ہو کر حکم مناسب صادر ہو گا"-(۹۰)

نومبر ۱۸۵۹ء سے جولائی ۱۸۶۰ء تک (ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ تا ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ) تقریباً" نو ماہ کی مدت جو باندہ کی جیل میں بسر ہوئی منیر کی زندگی کا انتہائی اذیت ناک دور تھا- ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں انہوں نے ایک قطعہ تاریخ لکھا ہے جس سے زندان باندہ کے حالات کا پتہ چلتا ہے- منیر بتاتے ہیں کہ فرخ آباد سے باندہ کا سفر ہر اعتبار سے ذلت و اذیت کی تصویر تھا- فرخ آباد کے اعزاء اور احباب سے جدا ہونے کا قلق کم نہ تھا کہ جسمانی اذیتیں بھی برداشت کرنا پڑیں اور یوں ان کی رسوائی میں کوئی کسر باقی نہ رہی- منیر پر چونکہ بغاوت وفساد کا الزام تھا اس لئے ذاتی عافیت وسلامتی کے خیال سے ان کے قریبی دوستوں نے بھی کنارہ کشی اختیار کی اور ان کے عزیز بھی ان کے لئے اجنبی ہو گئے، جس کا منیر کو قلق تھا-البتہ باندہ میں منیر کے ایک شاگرد وزیر خاں تھے جنہوں نے ہر قسم کے خطرہ کو مول لے کر منیر کی اعانت میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی- ان کے علاوہ منیر کے بعض مخلص دوست بھی وزیر خاں کی کوششوں میں شریک رہے لیکن نوشتۂ تقدیر کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی- منیر ایک ایسے شخص تھے جن کی زندگی کا مقصد ہی دوستوں کی دلجوئی اور بحدامکان دوسروں کے کام آنا تھا- جب ان پر یہ افتاد پڑی تو وہ بجا طور پر اپنے دوستوں اور شاگردوں سے یہ توقع کرتے تھے کہ وہ اس مشکل وقت میں اخلاقی اور عملی لحاظ سے ان کی مدد کریں گے- منیر کے عزیز شاگردوں میں مادھورام جوہر بھی تھے جن سے منیر کی دلی دوستی اور انتہائی قربت تھی لیکن منیر کو اس وقت بہت مایوسی ہوئی جب باندہ کے زنداں میں جوہر نے منیر کی کوئی خبر تک نہ لی- بظاہر اس تغافل کا سبب بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے- وجہ یہ تھی کہ اس ہنگامۂ داروگیر میں مادھورام جوہر بھی گرفتار ہوئے تھے مگر بعد میں ان کو غالباً" مناسب شواہد کی عدم

موجودگی کے باعث رہائی حاصل ہو گئی تھی۔ یہ واقعہ ۱۲۷۶ھ کا ہے۔ قیاس یہی ہے کہ اس مرحلہ پر جوہر نے مصلحتاً منیر کی طرف سے اغماز کیا لیکن منیر یہ سمجھتے تھے کہ ان کا یہ رویہ دوستی اور شاگردی کے کسی اصول پر پورا نہیں اترتا۔ وہ جوہر سے ناراض تھے جس کا اظہار انہوں نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں بہت واشگاف انداز میں کیا ہے جو انہی ایام میں کہی گئی ہے۔ غزل کے منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے منیر کی ذہنی کیفیت اور باطنی کرب کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں۔

راہ میں صورتِ نقشِ کفِ پا رہتا ہوں
ہر گھڑی بننے بگڑنے کو پڑا رہتا ہوں

عمرِ رفتہ نہ کبھی آئی منانے کے لئے
مدتیں گزریں کہ جینے سے خفا رہتا ہوں

صفتِ کینہ مرا گھر ہے فلک کے دل میں
گرہٴ خاطرِ دشمن میں بندھا رہتا ہوں

وطنِ خونِ شہیداں ہے اسی کشور میں
درمیانِ شفق آبادِ حنا رہتا ہوں

شمعِ تربت کی طرح ہے مری محنت برباد
پہرے پر طالعِ خفتہ کے کھڑا رہتا ہوں

بسکہ آفاتِ سماوی کی مجھے دہشت ہے
مثلِ خورشیدِ فلک رو بہ قفا رہتا ہوں

قید میں سیر ہے کیا، پائیں جو لاکھوں آنکھیں
میں عبث دامِ مصیبت میں پھنسا رہتا ہوں

پر کھلے ہیں، نہیں پرواز کی صورت افسوس
میں قفس میں صفتِ قبلہ نما رہتا ہوں

آبرو تھوڑی بھی ہے میری نمائش کو بہت
دانہ ساں خاک میں ہر چند ملا رہتا ہوں

کوئی دل ٹوٹے کہیں، خانہ خرابی ہو مری
شیشہ و سنگ میں مانندِ صدا رہتا ہوں
قید ہوں پر ستمِ غفلتِ جوہر سے منیر
غصہ بن کر دلِ زنداں میں بھرا رہتا ہوں (۹۱)

غزل کے پیرایہ میں یہاں، منیر نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو وہ ان حالات میں کھل کر بیان نہیں کر سکتے تھے۔ اپنی بربادی و پامالی کا ذکر، عہد گزشتہ کے پر آسائش دنوں کی یاد جواب ان سے روٹھ کر دور جا چکے ہیں، اہل زمانہ کی کینہ پروری، اپنے اردگرد ایک گنج شہیداں کو آباد دیکھنا، زنداں میں ہزاروں آنکھوں کے لئے ایک سامان تماشا بن جانا اور اس صورت حال کو ختم کرنے میں اپنی حد درجہ بے بسی، ایک انجانے خوف سے ہر وقت ہراساں رہنا اور دوسروں کے درد و غم پر ان کے شیشۂ دل کی شکست غرض اس دور ابتلا کا وہ کونسا رخ ہے جو اس آئینہ میں منعکس نہیں ہے۔

زنداں میں، منیر نے جو دن کاٹے، اس دوران میں ان کو سردی اور گرمی کے شدائد بھی برداشت کرنے پڑے اور جیل کے ملازمین کی بدسلوکیوں کا بھی نشانہ بننا پڑا۔ بقول منیر ان لوگوں کو اہل علم سے خدا واسطہ کا بیر تھا۔ وہ اشراف کے قاتل اور ہر تدبیر سے ان کو رنج پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ کج فطرت لوگ بے مروت، بے حیا اور مکر و فریب سے بھرے ہوئے تھے اور سو بہانے سے نقد جاں تک چھین لیتے تھے۔ قید وبند کی اذیتیں ان بدسلوکیوں پر مستزاد تھیں۔ قید باندہ میں منیر گزرے ہوئے دنوں کا دھیان دل میں لاتے تو ایک ایک واقعہ ان کی چشم خیال میں ابھرتا جس کو وہ اپنی طبع شعر گو کے حوالے کر دیتے۔

جن دنوں منیر فرخ آباد میں تھے ۱۲۷۶ھ میں (۱۸۵۹ - ۱۸۶۰ء) ایک طوائف نواب جان کا قتل ہو گیا۔ (۹۲) قاتل مصطفےٰ بیگ نامی ایک مکار شخص تھا اس نے دیکھا کہ حکومت منشی منیر کی طرف سے بدظن ہے تو اس نے کچھ ایسے جھوٹے شواہد بہم پہنچائے کہ منیر کو قتل کے الزام میں موت کی سزا ہو جائے اور وہ صاف بچ کر نکل جائے۔ اب منیر پر دوہرے الزام تھے، ایک بغاوت وفساد اور دوسرا نواب جان کے قتل کا۔

پر کہوں کیا کاوشِ اہلِ نفاق
تھے وہ خوں ریزی میں بڑھ کر تیر سے
شمر کا خنجر زبانیں ان کی تھیں
قتل کرتے تھے مجھے تزویر سے
مصطفیٰ بیگ ایک صاحب ان میں ہیں
کج روی میں بڑھ کے چرخِ پیر سے
کرکے خونِ ناحقِ نواب جان
مجھ کو بھی پھنسوا دیا تزویر سے (۹۳)

ان دنوں منیر نے جو غزلیں کہیں ان میں ایک خاص کسک اور درد مندی پائی جاتی ہے جو ان خاص حالات کا اثر ہے۔ ان غزلوں میں امید وبیم کی ملی جلی کیفیات کے پہلو بہ پہلو ایک عجیب احساس اذیت موجود ہے جس کا پیدا ہو جانا ایسے ماحول میں ناگزیر تھا۔ حالات کی رو ان کو مایوسی کی طرف بہا کر لے جا رہی تھی مگر ان کا یہ یقین کہ وہ بے قصور ہیں اور خدا کی نصرت پر ان کا بھروسہ ان کو حوصلہ اور استقامت عطا کرتا تھا۔ امید و یاس کے ملے جلے رنگ اس غزل میں دیکھتے چلئے تاکہ منیر کی ظاہری حالات کے ساتھ ان کے اندر بپا ہونے والی کشمکش کا کچھ اندازہ لگ سکے۔

سر کاٹنے کی تیغِ ادا کو خبر نہ ہو
یوں جان لیجئے کہ قضا کو خبر نہ ہو
دل سے سوا بلند رہے حوصلہ مرا
پہنچوں وہاں کہ بختِ رسا کو خبر نہ ہو
بوئے کباب سے نہ لگا لے کوئی پتا
یوں دل جلائیے کہ ہوا کو خبر نہ ہو
سب سے جدا بساؤں زمانہ میں شہرِ عشق
پست و بلندِ ارض و سما کو خبر نہ ہو
بہتر ہے دل ہی دل میں جو ٹھہرے معاملہ
چھپ کر پکارو، حرفِ ندا کو خبر نہ ہو

کیا فائدہ جو کھل کے مٹا صورتِ حباب
یوں نیست ہو کہ اصلِ فنا کو خبر نہ ہو

فرصت نہیں ہے زلف کے سلجھانے سے انہیں
مرجاؤں تو بھی ان کی بلا کو خبر نہ ہو

سب سے چھپا کے بھیج دے اے جان بوئے زلف
جاسوسِ ہرزہ گردِ صبا کو خبر نہ ہو

ہم بوستانِ دہر میں وہ کسِ مپُرس ہیں
ہوں بوئے گل تو بادِ صبا کو خبر نہ ہو

چٹکی ہے چاندنی مہِ داغِ فراق کی
للہ میرے ماہ لقا کو خبر نہ ہو

سب سے چھپا کے آپ اٹھائیں ہماری لاش
پر یہ نہ ہو کہ اہلِ وفا کو خبر نہ ہو

ہے کس حساب میں مری فریاد بے اثر
پھنک جائے صور ان کی بلا کو خبر نہ ہو

زلفیں کریں جو بختِ سیہ کا مقابلہ
نازل ہو وہ بلا کہ بلا کو خبر نہ ہو

ٹھکرا کے پائمال کیا بھی تو کیا مزا
یوں پیسیئے کہ رنگِ حنا کو خبر نہ ہو

بے پردہ چٹکیوں میں اڑانا ضرور کیا
برباد یوں کرو کہ ہوا کو خبر نہ ہو

آنکھوں میں جان اٹکی ہے وقفہ نہ کیجئے
یوں جلد آیئے کہ قضا کو خبر نہ ہو

روبہ فریب مجھ کو ستاتے ہیں اے منیر
ممکن نہیں کہ شیرِ خدا کو خبر نہ ہو (۹۴)

منیر پر ادھر باندہ میں مقدمات چل رہے تھے اور ادھر آگرہ میں مرزا ولایت حسین مشیر و دیوان نواب علی بہادر جو جرم بغاوت میں منیر کے شریک تھے، حکام نظامت عدالت کے روبرو اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کے منتظر تھے۔ چنانچہ مرزا ولایت حسین کو ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۰ء مطابق ۳ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ چودہ سال کی قید بامشقت کی سزا مع جلاوطنی بہ عبور دریائے شور سنادی گئی (۹۵) بعد میں یہ سزا کم ہو کر صرف چار سال رہ گئی۔ (۹۶) اور مرزا ولایت حسین کو آگرہ سے کلکتہ کے لئے روانہ کر دیا گیا تاکہ وہاں سے ان کو انڈمان (۹۷) بھیجا جا سکے۔ اس سے قبل باندہ میں منیر کو سات (۷) سال سزائے قید بہ عبور دریائے شور تجویز ہوئی۔ منیر کے انڈمان پہنچنے کی قطعی تاریخ کا تعین نہیں ہو سکا۔ قیاس یہی ہے کہ ان کو یہ سزا ۲ جولائی ۱۸۶۰ء (۱۷ ذی الحجہ ۱۲۷۶ء) کو سنائی گئی جس کے بعد ان کو باندہ سے الہ آباد بھیجا گیا جہاں سے وہ کلکتہ تک پیدل گئے اس پیادہ پا سفر میں کافی دن لگے ہوں گے۔ تاہم ایک بات یقینی ہے کہ منیر انڈمان میں ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء (یکم محرم ۱۲۷۷ھ) کے بعد کسی دن پہنچے۔الہ آباد سے کلکتہ تک کے سفر میں جہاں کہیں محافظ قیام کرتے، منیر کو بھی قید خانے کے سپرد کر دیا جاتا۔ بنارس میں قیدوبند کے عالم میں انہوں نے ایک فرمائشی غزل لکھی جو ان کے دیوان سوم "نظم منیر" میں شامل ہے۔ اس غزل کے کچھ منتخب اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں جو رمزواشارہ کی زبان میں، منیر کی ذہنی وجذباتی حالت پر ایک بلیغ تبصرہ ہیں۔

قید میں مثلِ خوشی صبر کیا غم کو بھی
عید کیا چیز ہے رو بیٹھے محرّم کو بھی

سوزِ دل میں، نفسِ سرد جو کھینچا ہم نے
برد اطراف ہوا نارِ جہنم کو بھی

پائمالِ تمنا میں پڑے ہیں کب سے
ایک ٹھوکر تو کبھی راہِ خدا ہم کو بھی

زہر پر اپنے نہ مغرور ہو اے افعی زلف
کھائے جاتے ہیں بلا نوش ترے سم کو بھی

مثلِ گل ہے بغلِ خار میں یکساں ناصح
اس گلستاں کی ہوا لگ گئی شبنم کو بھی

میری تقدیر میں بل ڈال دے بالکل اے چرخ
پیچ ڈھونڈے نہ ملے گیسوئے پُر خم کو بھی

جانِ شیریں کی تمنا میں لگا رہتا ہوں
چاٹ اس تحفہ مٹھائی کی پڑی غم کو بھی

زہر پر تیز ہیں مجروحوں کے دندانِ طمع
صلح الماس سے کرنی پڑی مرہم کو بھی

سر پٹکتا ہوں شبِ ہجر میں رونے کے لئے
پڑ گئی خوئے خوشامد طلبی غم کو بھی

میری کیا اصل ہے جو ان کی گلی میں نہ لٹوں
برہنہ کر کے نکلوا چکے آدم کو بھی

وقفہ اس باغ میں کس گل کو ملے زینت کا
ہار گندھوانے کی مہلت نہیں شبنم کو بھی

عید میں روتے ہیں، ہنستے ہیں محرّم میں اسیر
اپنے دن بھول گئے ہیں خوشی و غم کو بھی

سرخ پوشی یہ ہوئی خونِ شہیداں سے عام
کالے کپڑے نہ ملے ماہِ محرّم کو بھی

آتشِ داغِ جگر کے متحمل ہیں ہمیں
رعشہ ہوتا ہے، یہاں نیّرِ اعظم کو بھی

غم زدے آپ ہی مرتے تھے ہوئے اس پر قید
طوق سے کام پڑا حلقۂ ماتم کو بھی

سخت جانی کے شبِ ہجر کھڑے ہیں پہرے
ہونٹوں پہ آکے ٹھہرنا نہ پڑے دم کو بھی

ہوئی زندانِ بنارس میں جو یہ فرمائش
آگیا رحم دمِ فکرِ سخن، غم کو بھی
اس جزیرے کو چلے ہند سے مجبور منیر
کہ نہ تھی جس کی خبر آدم و عالم کو بھی (۹۸)

راستہ میں جو جو صعوبتیں، جسمانی تکالیف اور ذہنی اذیتیں منیر نے برداشت کیں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ایک غریب شاعر، صاحب علم وفضل، موسم کے شدائد اٹھاتا، ہتھکڑیوں اور زنجیروں میں جکڑا ہوا پاپیادہ، طویل سفر درپیش، اردگرد کسی کو اپنا نہیں پاتا جو اپنے دل کی بات بھی کہہ سکے۔

پھر الہ آباد میں بھجوا دیا
ظلم سے، تلبیس سے، تزویر سے
ننگی تلواریں کھنچی تھیں گرد و پیش
نوکیں سنگینوں کی بدتر تیر سے
جو الہ آباد میں گزرے ستم
ہیں فزوں تقریر سے، تحریر سے
پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں
گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں، بیڑی پاؤں میں
ناتواں تر قیس کی تصویر سے
راستے میں ظلم اعداء بے شمار
ہر گھڑی تھے شامتِ تقدیر سے
بے حواس و بے لباس و بے دیار
دل گرفتہ جورِ چرخِ پیر سے (۹۹)

جس جس طرح کی اذیتیں اور ذلتیں اور بھوک پیاس کی شدت اس سفر کے دوران منیر کو برداشت

کرنا پڑی اس کی جانب بڑے بلیغ اشارے انہوں نے اپنے قصیدے "شمس المناقب" میں بھی کئے ہیں - ان صدمات میں اعزاء کی بے رخی کے علاوہ نگہبانوں کی زبان درازی اور مارپیٹ تک شامل تھی، چنانچہ بیان کرتے ہیں۔

ہزاروں طرح کی جفائیں اٹھا کر
چلا قید ہو کر میں زنداں کی جانب
مری قید و تکلیف و ذلت کے باعث
اقارب اباعد، احبّا اجانب
برہنہ بدن طوق و زنجیر پہنے
مشارق سے لیکر پھرا تا مغارب
پیادہ روی اور بُعدِ مسافت
ستم گار تلواریں کھینچے مراقب
نگہبانوں کے جورِ دست و زباں سے
لکد کوب آلاف رنج و نوائب
ادھر سخت آلام جوع و عطش کے
بلا اس طرف سبّ و شتم و معاتب (۱۰۰)

منیر نے ان حالات میں خود کو کس طرح سنبھالا ہو گا جب اس کی طرف دھیان جاتا ہے تو ان کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے۔

غرض بصد خرابی منیر کلکتہ پہنچے تو قاعدہ کے مطابق ان کی تصویر کھنچوائی گئی۔ تصویر دیکھی تو تغیر حال کا اندازہ بھی ہوا اور شدید غم بھی۔ مگر ہر ذلت اور اذیت کو جیسے انہوں نے اپنا مقدر جان کر قبول کر لیا تھا۔

منیر جب جہاز کے ذریعہ کلکتہ سے انڈمان پہنچے تو یہ زنجیریں کاٹ دی گئیں جس پر انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور قطعہ نظم کیا جس کے آخری اشعار بے اندازہ مسرت کے حامل ہیں۔ آخری شعر سے اس ذلت و اذیت سے رہائی کی تاریخ بھی بر آمد ہوتی ہے۔

کالے پانی میں جو پہنچے یک بیک
کٹ گئی قیدِ ستم تقدیر سے
یہ کہی تاریخ ہم نے اے منیر
صاف نکلے خانۂ زنجیر سے (۱۰۱)

ان ہی ایّام میں منیر نے ایک غزل کہی جس کی ردیف "بیڑیاں" ہے۔ غزل کے مقطع میں جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے نہ صرف باندہ کی ذلت آمیز قید سے رہائی پانے پر اظہار مسرت کیا گیا ہے بلکہ ضمناً" ان صعوبتوں اور اذیتوں کو بھی بیان کرنے کی سعی کی ہے جو الہ آباد سے کلکتہ تک کے سفر میں منیر کو برداشت کرنا پڑیں۔

پاؤں کو دیتی ہیں رنگِ خونِ جاری بیڑیاں
جنگلوں میں کر رہی ہیں لالہ کاری بیڑیاں
ناتوانی میں دباتی ہیں' ہماری بیڑیاں
ہلکے سے ہلکے ہیں ہم' بھاری سے بھاری بیڑیاں
سوئے کلکتہ' الہ آباد سے پیدل چلے'
چوبِ مورِ لنگ پر سیکھیں سواری بیڑیاں
پاؤں چل سکتے نہیں' ہاتھ اپنے بڑھ سکتے نہیں
ہوگئیں ہتھکڑیوں کے مانند بھاری بیڑیاں
ہم ہیں پیدل' راہ طولانی' سفر ہے دور کا
دیکھئے منزل ہے بھاری' یا ہیں بھاری بیڑیاں
بھاگے قیدی راہ میں پر ہم رہے ثابت قدم
وقتِ لغزش کر چکی ہیں پائیداری بیڑیاں

ہند سے یہ غل مچاتی آئیں تا دریائے شور
بحر و بر میں کر چلیں احکام جاری بیڑیاں

لغزشِ زنداں میں ہتھکڑیاں ہوئی ہیں دست گیر
پاؤں پڑ کر کرتی ہیں خدمت گزاری بیڑیاں

لالہ سنبل سے ، بنفشہ سے کھِلا ہے ارغواں
پاؤں میں کرتی ہیں پیدا زخمِ کاری بیڑیاں

کالے پانی میں یہ کالی ناگنیں بھی بہہ گئیں
مارِ ماہی بن گئیں گویا ہماری بیڑیاں

دور کروادیں خدا نے انڈمن میں خود بخود
کرتی تھیں برسوں کی ناحق ذمہ داری بیڑیاں

قطعِ زنجیرِ ستم کی ہے یہ تاریخ اے منیر
کٹ گئیں کیا لطف سے آپہی ہماری بیڑیاں (۱۰۲)

(۱۲۷۷)ھ

مقدمہ

منیر کو انڈمان کی سزا کیوں ملی' یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں اختلاف رائے موجود ہے۔ ایک گروہ (۱۰۳) تو ان کو جنگ آزادی کا ہیرو سمجھتا ہے جبکہ دوسرا گروہ (۱۰۴) ان کی سزا کو مسماۃ نواب جان طوائف کے قتل میں منیر کے ملوث ہونے پر محمول کرتا ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مولف تاریخ ادب اردو (۱۰۵)اور علامہ کیفی چڑیا کوٹی مولف جواہر سخن (۱۰۶) کے علاوہ ڈاکٹر زہرہ بیگم یاسمین (۱۰۷) اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (۱۰۸) بھی منیر کی سزا کا سبب نواب جان ہی کے قتل کو قرار دیتے ہیں' مگر اس سلسلہ میں جو معاصر اور داخلی شہادتیں بہم ہو سکتی ہیں ان سے یہ نتیجہ نکالنا چنداں دشوار نہیں کہ منیر کی سزائے انڈمان' جرم بغاوت ہی کا شاخسانہ تھی۔ منیر کی زندگی کا یہ پہلو کسی قدر تفصیلی تجزیہ کا طلب گار ہے۔

منیر کا تعلق جس عہد اور جس معاشرہ سے تھا اس میں طوائف کو یقیناً ایک مرکزی حیثیت اور خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس زمانہ کی عیش ونشاط سے بھرپور زندگی کو ' جس میں عام شخص امراء اور اپنے مربّیوں کی پیروی میں حسب استطاعت شریک ہونے کی کوشش کرتا' کوئی ایسی معیوب بات نہیں سمجھتا تھا بلکہ یوں کہا جائے کہ جو شخص اس خاص قسم کی زندگی میں جس حد تک دخیل ہوتا اسی حد تک گویا اس کا سماجی منصب بلند تصور کیا جاتا۔ طوائف سے تعلق' ان کے یہاں آنا جانا اور ان کا گانا سننا اس خاص معاشرہ میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ اکثر طوائفیں ڈیرے دار تھیں اور امراء و روسا کے درباروں میں باقاعدہ ملازم ہوتی تھیں۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق منیر کی بھی بعض طوائفوں سے یقیناً" رسم وراہ ہو گی جس کا ثبوت منیر کے ایام جوانی کا وہ قطعہ تاریخ ہے جو انہوں نے اپنی محبوبہ کے مرنے پر کہا اور ان کے دیوان اول میں موجود ہے۔ (۱۰۹)۔ مرنے والی ایک پیشہ ور طوائف تھی۔ جہاں ہوا وہوس کا دور دورہ ہو' وہاں رقابت اور حسد کے جذبات کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ نواب جان کا قتل بھی کسی ایسے ہی منتقمانہ سرکش جذبے کا نتیجہ ہو گا۔ یہ قتل کن حالات میں رونما ہوا۔ مصطفےٰ بیگ کون تھا۔ مصطفےٰ بیگ اور منیر کے مراسم کی نوعیت کیا تھی' ان امور کے بارے میں کچھ وثوق سے کہنا دشوار ہے۔ البتہ ایک بات یقینی ہے کہ مقتولہ نواب جان نواب فرخ آباد کی محبوبہ تھی اور اس تعلق سے منیر سے بھی اس کی شناسائی ہوگی۔ اس امر کی تصدیق منشی بشن نرائن حامی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ ہمیں نواب جان کے متعلق بتاتے ہیں کہ اس قتل کا صحیح سبب تو بیان کرنا ذرا مشکل ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ مقتولہ نواب جان نواب صاحب کی محبوبہ تھی اور یہ کہ اس بات کا علم ان کو بعض ایسے افراد سے ہوا ہے جو اندرون خانہ زندگی سے باخبر تھے۔(۱۱۰) بشن نرائن حامی کے بیان کو ایک اہم معاصر شہادت تصور کرنا چاہیے کیونکہ ان کے والد دیبی سہائے صادق منیر کے خاص شاگرد تھے۔

منیر کو اپنے زمانے کے رؤسا کی ذاتی اور نجی زندگیوں سے کس قدر تعلق تھا' اس امر کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے حکیم محمد حسین خان طبیب کے نام رام پور سے لکھا ہے (۱۱۱)۔ طبیب منیر کے شاگرد اور ریاست گوالیار میں طبیب اعلیٰ کے عہدے پر فائز تھے' انہی طبیب کے بارے میں منیر نے کہا تھا۔

نام میرا کیا بلند اس نے
مجھ پہ اللہ کا کرم دیکھو (۱۱۲)

رام پور میں فرخ آباد کی رہنے والی ایک طوائف اور اس کی دختر نواب کی سرکار سے کچھ عرصہ سے وابستہ تھیں۔ نواب ان کی بدکرداری اور غلط اوضاع واطوار کے سبب ان سے ناراض ہو گئے اور ان کو نہ صرف ملازمت سے علیحدہ کر دیا بلکہ رام پور سے بھی ان کو شہر بدر کر دیا گیا۔ یہ دونوں رام پور سے نکل کر مراد آباد آگئیں۔ عدّت کے دوران انہوں نے طبیب یا کسی اور شخص کے توسط سے مہاراجہ گوالیار سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ بات جب منیر کے علم میں آئی تو انہوں نے ضروری سمجھا کہ خط کے ذریعہ محمد حسن خان طبیب کو آگاہ کر دیں تاکہ کسی مرحلہ پر دونوں ریاستوں کے خوشگوار تعلقات خراب نہ ہونے پائیں۔ طبیب کو ریاست میں اہم منصب حاصل تھا اور وہ بھی چونکہ فرخ آباد کے رہنے والے تھے جہاں کی وہ معتوب طوائفیں تھیں، منیر کو یہ بھی خیال آیا ہو گا کہ کہیں نا نکہ اپنی اور طبیب کی ہم وطنی اور اپنے نوخاستہ جمال زیبا کو سفارش کے طور پر کام میں نہ لائے۔ منیر طبیب کو تمام صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"برضمیر منیر دوست مخفی ممناد کہ فلانہ و دخترش بعلت رواءت اوضاع و انہماک بافعال نکوہیدہ وتمرن و اعتیاد. بمعاشرت الواط و اوباش و مداومت و ادمان اختلاط بہ سفہا و بدقماش ازنوکری ایں سرکار دولت مدار معزول و از اقامت و بودوباش دریں بلدۂ الخیر ممنوع و مخذول گردیدہ بہ مراد آباد رخت ادبار کشیدہ حالیا چناں بہ سماع و سیاع رسیدہ والعمدۃ علی من تیغوہٗ بہ کہ بعض متوسلان آن دولت دوران عدت و منہم مخدومی خاصتہ" تحریک علاقہ آن فاجرتیں عابرتین درسلسلہ مستملین ازیال ملازمان مہاراج صاحب بہادر می فرمانید ہرچند ایں معنی از دور اندیشی مآل بینی مخدوم مستبعد وبدیع می نماید اما تحمیل کہ احد ہما توطن سواد فرخ آباد را شفیع آوردہ و اخرے بیاض رخسار و قامت فتنہ راوسیلۂ نظر فریبی ہا قرار دادہ باشد کیف ماکان بشرط صدق ایں روایت ارتکاب امور کذائیہ ازخیرطلبان جانبین منہل عذب دوستی دولتین راتلخ تر و ماء معین

مشرب اتحاد ریاستین را مکدر می سازد"۔(۱۱۳)

آگے چل کر اسی خط میں منیر شکوہ آبادی رقم طراز ہیں کہ خدا نخواستہ اگر یہ روایت عام ہوئی تو کیا ہو گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی تلافی کی کوشش کی جائے اور یہ خرابی جو ابھی سوئی کے ناکے سے زیادہ نہیں حسن تدبیر سے اس کو اس طرح رفع کیا جائے کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کا تدارک ممکن ہو سکے۔ منیر کے اس خط سے ایک بات واضح ہے کہ ان کو اپنے مربّیوں کی ذاتی زندگی اور نجی معاملات سے دلچسپی ضرور تھی اور وہ حسب موقع بگڑے ہوئے حالات کو سنوارنے کی سعی بھی کرتے تھے۔ یہ عین ممکن ہے کہ نواب فرخ آباد کی محبوبہ نواب جان سے بھی ان کی شناسائی نواب موصوف ہی کی بدولت رہی ہو یا پھر خود منیر کی بھی اس سے جان پہچان ہو۔ ایک بات یقینی ہے کہ ان کو مقتولہ سے واقعی ہمدردی تھی۔ یوں نہ ہوتا تو وہ اس کے قتل کو "خون ناحق" اور مصطفیٰ بیگ کے اقدام کو تزویر سے تعبیر نہ کرتے۔

کر کے خونِ ناحقِ نوّاب جان

مجھ کو بھی پھنسوا دیا' تزویر سے (۱۱۴)

اسی تعلق کے سبب جو منیر کو نواب جان سے تھا' منیر کو اس قتل میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ مصطفیٰ بیگ نے اپنے بیان میں یا پھر پولیس کو ایسے شواہد فراہم کئے کہ منیر اس سے نہ بچ سکے۔ "بغاوت" میں شرکت کے سبب' حکومت پہلے ہی ان کی طرف سے بدظن تھی' اس صورت حال سے مصطفیٰ بیگ نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر زہرہ بیگم یاسمین منیر کے مقدمہ اور سزا کے بارے میں لکھتی ہیں۔

" ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں بہ غرض شرکت امداد فرخ آباد ولایت حسین وزیر باندہ کے ساتھ جانے کے سلسلے میں مقدمہ منیر پر قائم ہوا' وہ برابر چلتا رہا' ۱۲۷۶ھ میں ایک دوسرا مقدمہ اس قتل کے سلسلے میں ان کے خلاف قائم ہو گیا جس میں وہ نواب جان کے قتل میں شامل کئے گئے اور ان کو سزائے حبس دوام ہوئی"(۱۱۵)

اس بیان سے بعض الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ منیر کی گرفتاری ۱۲۷۴ھ میں نہیں بلکہ ۱۲۷۶ھ میں عمل میں آئی۔ دوم ڈاکٹر زہرہ بیگم کے بیان سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ منیر جب باندہ

کی جیل میں تھے اس وقت ان کے خلاف دوسرا مقدمہ ۱۲۷۶ھ میں قائم ہوا۔ حالانکہ جس وقت نواب جان کا قتل ۱۲۷۶ھ میں وقوع پذیر ہوا (۱۱۶) تو منیر باندہ کی جیل میں نہیں بلکہ فرخ آباد میں روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ اگر بقول ڈاکٹر زہرہ بیگم یاسمین اس وقت باندہ کی جیل میں تھے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کو نواب جان کے قتل میں کس طرح ملوث کر لیا گیا۔ اسی طرح ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا یہ کہنا کہ منیر پر غدر کے سلسلہ میں کوئی مقدمہ چلا بھی تو وہ بہت جلد بری ہو گئے اور اس کے بعد فرخ آباد میں رہنے لگے (۱۱۷) اس سیاسی مقدمہ کے وجود ہی کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ منیر کی گرفتاری فرخ آباد میں جرم بغاوت ہی کے سبب عمل میں آئی (۱۱۸) جس کے بعد انہوں نے ایک برس سے کچھ کم مدت انتہائی مصائب میں باندہ کی جیل میں قیدوبند کے شدائد برداشت کرتے ہوئے بسر کی۔

منیر کو کالے پانی کی سزا کیوں ملی' یہ الجھن دراصل خود منیر کے اپنے بیان سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ " قطعہ تاریخ مصائب قیدوحالات زنداں " میں لکھتے ہیں۔

پر کہوں کیا کاوشِ اہلِ نفاق
تھے وہ خوں ریزی میں بڑھ کر تیر سے
مصطفیٰ بیگ ایک صاحب ان میں ہیں
کجروی میں بڑھ کے چرخِ پیر سے
کرکے خونِ ناحقِ نوّاب جان
مجھ کو بھی پھنسوادیا تزویر سے (۱۱۹)

اس کے بعد انہوں نے مصائب زنداں کی تفصیل پیش کی ہے اور جب ان کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا سنا دی گئی تو باندہ کی جیل سے الہ آباد اور الہ آباد سے کلکتہ روانہ کیا گیا تاکہ جزائر انڈمان بھیجا جا سکے۔ اس تمام سفر کو بھی وہ ظلم " تلبیس اور تزویر " کا نتیجہ قرار دیتے ہیں' جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سزا ان کو نواب جان طوائف ہی کے قتل کے جرم میں دی گئی تھی' جبکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ یہ قتل محض ایک بہانہ تھا ورنہ مقصود سزا سراسر سیاسی تھا۔

منیر کا ایک قریبی تعلق' فرخ آباد اور باندہ کی ریاستوں سے تھا اور یہ دونوں ریاستیں جنگ

آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہ چکی تھیں۔ پھر منیر کے اپنے قطعہ ہائے تاریخ جو انہوں نے اس ہنگامہ کے دوران مختلف مواقع پر کہے اور جن میں شہادت پانے والوں کے ساتھ دلی ہمدردی اور مجاہدین کی فتح ونصرت پر اظہار مسرت کیا گیا تھا' اس جدوجہد میں ان کی شرکت کا واضح ثبوت تھے۔ انگریزوں کو اگر منیر کو سزا دینے کے لئے قتل کا یہ بہانہ ہاتھ نہ آتا' تب بھی وہ سزا سے نہیں بچ سکتے تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں جرم وسزا کی حالت یہ تھی کہ پولیس جس شخص کے خلاف چاہتی ایسے جھوٹے ثبوت فراہم کرتی کہ دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ اصل خطاکار اور مجرم یہی شخص ہے۔ نائٹن جو نصیرالدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ آیا اس بارے میں ملکی حالت کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

" اس ملک میں کوئی سنگین واقعات ایسے نہیں ہوتے جس میں پولیس کچھ بے گناہ غریبوں کو پکڑ کر سزا نہیں دلا دیتا (دیتی) اور جن کی بابت اگر تم پولیس کے بیان پر یقین کرو تو کافی شہادت پیش ہو جائے گی کہ اصل خطاکار اور مجرم یہی ہیں۔" (۱۲۰)

اس صورت حال میں منیر کا ناکردہ گناہی میں پکڑا جانا اور سزا پانا باآسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔

منیر کی سزائے انڈمان کا سبب محض مسماۃ نواب جان طوائف کے قتل کو قرار دینا' دراصل اس کردار کشی کی سازش کا حصہ دکھائی دیتا ہے جس کے تحت انگریزوں نے واجد علی شاہ جیسے علم دوست اور قابل شخص کو محض ایک عیاش اور ناکارہ فرماں روا بنا کر پیش کیا ہے اس طرح کہ ان کی ذاتی خوبیوں پر بھی پردہ پڑ گیا ہے۔ واجد علی شاہ فنون لطیفہ کے سرپرست تھے' شاعری رقص وسرود' مطالعہ وکتب بینی کو ان کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ واجد علی شاہ کا دربار اہل لکھنؤ کے لئے دارالامن تھا جس سے بقول واجد علی شاہ سترہ سو ادباء وشعراء اور پانچ سو اطباء وابستہ تھے' وہ "حزن اختر" میں لکھتے ہیں۔

فقط سترہ سو تھے اہلِ قلم
طبیبوں کو کر پانچ سو تو رقم (۱۲۱)

واجد علی شاہ کی عیش پرستانہ زندگی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی غرض انگریزوں کے پیش نظر بجز

اس کے کچھ اور نہ تھی کہ سلطنت اودھ پر قبضے کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ انگریزوں نے جہاں انصاف کے ہر تقاضے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جنگ آزادی کے مجاہدین پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے وہیں ان کو غیر پسندیدہ افعال وکردار کا حامل بنانے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

منیر کے ایام اسیری اور ان کی زندگی بالخصوص انڈمان سے رہائی کے بعد کے دنوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو کوئی ایک ثبوت بھی ایسا نظر نہیں آتا جس سے یہ قتل کا الزام درست ثابت ہوتا ہو، بلکہ بعض ایسی عصری اور داخلی شہادتیں سامنے آتی ہیں جن سے ان کا سیاسی قیدی ہونا ثابت ہے۔

(الف)

۱۲۷۹ھ میں اپنے قیام انڈمان کے دوران منیر نے ایک " قطعہ تاریخ در حالات تلامذہ " لکھا ہے جس میں اپنے کئی شاگردوں کا ذکر نام بنام کیا ہے۔ اس قطعہ میں وہ کالے پانی کا سبب بلوہ عام ہی کو قرار دیتے ہیں۔

ہوا جس وقت برپا فتنۂ عام
ستم سے میں ہوا پابندِ زنداں
جفائیں سینکڑوں سہہ کر یہاں کی
سمندر میں چلا افتاں و خیزاں
اتارا کالے پانی میں فلک نے
جہاں ہے بحرِ آفت صرفِ طوفاں (۱۳۲)

(ب)

ان کے مشہور قصیدہ " فریاد زندانی " کا ایک شعر ہے:

جو ٹھہرے مدعی، قاضی وہی، مفتی وہی ٹھہرے
اگر ہو غیر ثالث تو عدالت کی ہو آسانی (۱۳۳)

یہ شعر اس مقدمہ کی کارروائی سے متعلق ہے جس میں ان کو کالے پانی کی سزا ہوئی، اس شعر سے واضح ہے کہ منیر نہ صرف اس سزا کو جو ان کو دی گئی، انصاف کے تقاضوں کے منافی سمجھتے تھے بلکہ اس شعر میں اس امر کی طرف بھی واضح اشارہ موجود ہے کہ منیر کے خلاف مدعی انگریز تھے نہ کہ نواب جان کے متعلقین۔ اگر یہ سزا محض قتل کے جرم میں ہوتی تو وہ انگریزوں ہی کو مدعی، قاضی

اور مفتی سب کچھ نہ کہتے۔

(ج)

منیر نے اپنے ایک فارسی نثرپارے میں جو بعض دوستوں کی فرمائش پر انڈمان سے لکھ کر بھیجا گیا وہاں کی زندگی اور قیدوبند کے بارے میں اپنے تاثرات و تجربات تحریر کئے ہیں۔اس عبارت میں وہ لکھتے ہیں کہ میں اس وقت جہاں ہوں اس کو زندوں کی قبر سمجھنا چاہئے۔ ان کے خیال میں یہ وہ مقام ہے کہ جس کا نام سن کر جن اور بھوت سو سال کی مسافت کے فاصلے پر بھاگ جاتے ہیں -وہ یہاں دیکھنے والوں کے لئے سامان عبرت بن گئے ہیں -یہاں کسی وقت بھی کوئی غیر متوقع بات رونما ہو سکتی ہے۔ منیر لکھتے ہیں۔

"حالے خواطر زاکیہ اخوان ایمانی باد کہ از بدو زمان اسیری بفحوائے ارشاد حضرت یوسف علی نبیناو آلہ و علیہ السلام السجن قبور الاحیاء' عبرت نظارگیاں گشتم و بالاتر ازاں ببلیہ غربت کہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ الجلاء اعظم البلاء ازاں خبری دہد مبتلا شدہ اندریں جزیرہ موحشہ کہ غیلان و عفاریت ہم از نام آں صد سالہ راہ می برند درسلک مصادیق ثم لایموت فیھا و لا یحییٰ اعاذنا" اللہ منھا در آمدم۔ ہر لحظہ منتظر آفت ناگہانی و ہر لمحہ امیدوار بلائے آسمانی بودہ ام آرے ۔

ہر گاہ سنگِ حادثہ از آسماں رسد
اول بلا بہ مرغِ بلند آشیاں رسد (۱۲۴)

اس عبارت میں جو فارسی شعر آیا ہے اس میں منیر نے آفات سماوی کے مقابل خود کو ایک بلند آشیاں پرندہ تصور کیا ہے۔ وہ اگر یہ قید کسی اخلاقی جرم کی پاداش میں کاٹ رہے ہوتے تو خود کو کبھی ایسے پرندے سے تشبیہ نہ دیتے جس کا آشیانہ انتہائی بلندی پر واقع ہے۔

(د)

منیر جن دنوں انڈمان میں سزا بھگت رہے تھے اور بھی کچھ مجاہدین آزادی اور سیاسی وملی رہنما مثلاً" مرزا ولایت حسین حکیم' سید نصرت حسین اور مولانا فضل حق خیر آبادی بھی وہاں قید تھے۔ حکیم سید نصرت حسین کے فرزند صدیق حسین اپنے ایک خط میں جو انہوں نے ابوالخیر کشفی کے نام ۱۲ نومبر ۱۹۶۴ء کو کوڑہ جہاں آباد سے تحریر کیا ہے اور جس میں انہوں نے اپنے والد گرامی اسیر مالٹا حکیم نصرت حسین کی شہادت کا حال لکھا ہے' ضمناً" منیر کے مقدمہ وسزا

کی نوعیت پر بھی اظہار خیال کر گئے ہیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ یہ باتیں ان کو اپنے والد ہی سے معلوم ہوئی ہوں گی جو منیر کے رفیق زنداں رہ چکے تھے۔ صدیق حسین صاحب لکھتے ہیں۔

" میرے والد اسیران مالٹا کی جماعت کے پہلے شہید ہیں مگر ان سے پہلے ایک اور پاک روح نے انڈمان میں اپنی جان' جان آفریں کے حوالے کی یعنی مولانا فضل حق خیر آبادی نے جو منیر شکوہ آبادی کے ساتھ سرکار انگلشیہ سے بغاوت کے الزام میں گرفتار کئے گئے اور یہاں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ میں انتقال فرمایا۔ اسیران مالٹا پر وہابی ہونے کی تہمت لگی اور غریب منیر پر طوائف کشی کی۔"(۱۲۵)

(۵)

آگرہ میں ۱۸۶۹ء میں منشی نیاز علی پریشان نے ایک مشاعرہ منعقد کیا جس کا ذکر گارساں دتاسی نے بھی اپنے خطبات میں کیا ہے' وہ لکھتا ہے۔

" مشاعروں کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ ایک بڑا مشاعرہ آگرہ میں ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ہونے والا ہے۔ اودھ اخبار مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۸۶۹ء میں ان شعراء کے لئے ہدایات کا اعلان شائع ہوا ہے جو اس مشاعرہ میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ ان ہدایات میں ہے کہ شعراء پہلے سے اپنا نام' تخلص' مذہب' عمر' استاد کا نام اور یہ کہ آیا استاد زندہ ہے یا فوت ہو گیا' مطبوعہ دواوین کے نام اور دوسرے حالات کے متعلق' اطلاع کر دیں۔(۱۲۶)

اس مشاعرہ میں آگرہ کے تمام مشاہیر شعراء شریک ہوئے۔ منیر شکوہ آبادی انڈمان سے رہائی کے بعد الہ آباد سے آگرہ اپنے ننھیال آئے ہوئے تھے انہوں نے بھی اس مشاعرہ میں شرکت کی اور طرح میں غزل کہہ کر پڑھی' منشی نیاز علی پریشان نے یہ بھی اہتمام کیا کہ اس مشاعرہ میں پڑھی جانے والی غزلوں کو ایک گلدستہ کی شکل میں " شعر و سخن"(۱۲۷) کے نام سے شائع کیا۔

ہر شاعر کی غزل سے پہلے خود اس شاعر کے مختصر خودنوشت حالات بھی درج کئے ہیں' اس گلدستہ میں منیر خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔

"حالیا بعد اسیریٔ بلوائے عام بیکار و خانہ نشین در الہ آباد است"

پروفیسر حامد حسن قادری کی نظر سے بھی "شعروسخن" نام کا یہ گلدستہ گزرا تھا۔ ان کے مضامین "آگرے کے قدیم مشاعرے" کا ماخذ یہی گلدستہ ہے۔ حامد حسن قادری، منیر شکوہ آبادی کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں۔

"غدر ۱۸۵۷ء کے بعد بغاوت وسیاست کی لپیٹ میں منیر بھی آگئے اور جلاوطن کرکے کالے پانی بھیج دیئے گئے۔ کئی سال وہاں رہے"(۱۲۸)

(د)

منشی منیر شکوہ آبادی نے عبدالغفور نساخ کی کتاب "انتخاب نقص" کے جواب میں "سنان دلخراش" ۱۲۹۶ھ میں لکھی اور اس میں ان تمام اعتراضات کا مدلل جواب دینے کی کوشش کی جو نساخ نے لکھنؤ کے مستند شعراء آتش، ناسخ، وزیر، صبا، انیس، دبیر، منیر اور امیر پر وارد کئے تھے۔"سنان دلخراش " کا مخطوطہ جو اب لکھنؤ یونی ورسٹی کی ٹیگور لائبریری کی ملکیت ہے، شاہ مبین الہ آبادی کی تحویل میں رہا۔ بقول ڈاکٹر سید نورالحسن صاحب ہاشمی (۱۲۹) مبین الہ آبادی ذی استعداد آدمی تھے اور غالباً" منیر کے ہم عصر۔ چنانچہ اس مخطوطہ پر تمہید ان ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ متن پر جگہ جگہ ان کے دستخط اور حواشی موجود ہیں۔ مبین الہ آبادی منیر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"غدر ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں ان کا تعلق نواب صاحب باندہ سے تھا، اس لئے باغی قرار پا کے کالے پانی بھیجے گئے"(۱۳۰)

ان ذاتی اور عصری شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ منیر شکوہ آبادی کو جو کالے پانی کی سزا ہوئی وہ کسی اخلاقی جرم کا نتیجہ نہ تھی بلکہ واضح طور پر مجاہدین کی اعانت کا ردعمل تھی جو انہوں نے نواب علی بہادر کی ملازمت کے دوران انگریزوں کے خلاف کی۔ اس اعتبار سے حسن افضل بدر، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی اور ضیاء احمد بدایونی کی آراء اگرچہ بیشتر قیاس اور خاندانی روایات پر مبنی ہیں مگر ان میں بہرنوع ایک صداقت موجود ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا بھی یہی خیال ہے کہ منیر ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے نواب علی بہادر کو انگریزوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا تھا اور باندہ و فرخ آباد کے ناکام معرکوں کے بعد منیر گرفتار ہوئے ان پر مقدمہ چلا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی۔(۱۳۱)

بغاوت میں اعانت کے جرم میں منیر کو سزا بھی ہوگئی اور وہ انڈمان چلے بھی گئے لیکن وہ اس مقدمہ کی کارروائی، گواہوں کے بیانات، اس خاص معاملہ میں دوستوں کی عدم مروت اور مقدمہ کے فیصلے سے قطعی طور پر نامطمئن تھے۔ ان کو احساس تھا کہ انگریز حاکم ان کو سزا دینے پر تلے ہوئے تھے تو پھر کوئی شخص بھی ان کو اس ذہنی و جسمانی اذیت سے کس طرح بچا سکتا تھا۔ انڈمان پہنچنے کے بعد جب وہ گزشتہ حالت کے بارے میں سوچتے، تو ایک مدت گزرنے کے بعد اب واقعات زیادہ حقیقی آب و رنگ کے ساتھ ان کے سامنے آتے۔ ایک نعتیہ قصیدہ میں وہ اپنے مقدمہ کے بارے میں کہتے ہیں۔

رخِ احباب سے ظاہر ہوا ہے بغضِ پنہانی
صفائی کے گواہوں میں ہے کاذب صبح پیشانی
ہوئے فرماں روا خود مدعی، ماخوذ فرماں بر
تامل کی نظر سے اس کو دیکھیں انسی و جانی
عدالت ان دنوں ایسی بڑھائی ہے زمانہ نے
کہ شمشیر و گلو پیتے ہیں ایک ہی گھاٹ پر پانی
کرے جو استغاثہ خدمتِ حکّامِ اعلیٰ میں
بحالی حکمِ اول کی سنائیں قاضی و دانی (۱۳۲)

۱۸۵۷ء اور معاصر زندگی کی تصویر کشی

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران اور اس کے بعد کے دنوں میں منیر کی پریشانیاں اور مشکلات اگرچہ ذاتی نوعیت کی تھیں لیکن وہ اپنے گردوپیش رونما ہونے والے واقعات سے کیسے لاتعلق رہ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جنگ آزادی کے زمانے کے عام حالات بڑی تفصیل سے ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے قصیدہ "فریاد زندانی" میں اس زمانہ کی حالت کو ایک شاعر کے نقطۂ نظر سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ احساسات وجذبات صرف منیر ہی کے نہ تھے بلکہ اس عہد کے دوسرے لوگ بھی ان میں برابر کے شریک تھے۔ اس قصیدے کی تشبیب ایک شہر آشوب کی

حیثیت رکھتی ہے۔ اشعار سے لکھنؤ کی عمارات پر انگریزوں اور ان کے حاشیہ برداروں کے قبضہ' امراء و شاہی خانوادوں کی مکمل تباہی' لکھنؤ میں قتل عام' امراء و شرفا کی حالت زار اور معاشی ابتری کی بڑی موثر تصاویر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

پھنسا ہے موذیوں کے قبضہ میں حسنِ جہاں آرا
قمر در عقرب ان روزوں بنا ہے ماہِ کنعانی
غنی ہیں اژدہا و سیل و چغد و بوم ان روزوں
کے دیں گے سلاطینِ جہاں جاگیرِ ویرانی
پھنسے ہیں ایک جا ادنیٰ و اعلیٰ واہ ری قسمت
برابر خانۂ زنجیر میں ہے سب کی مہمانی
بچھونا ٹاٹ' کمل اوڑھنا ٹھہرا ہے ان روزوں
کوئی اوڑھے بچھائے لیکے ایسا رحمِ سلطانی (۱۳۲)

شاہی خاندان کے افراد کی حالت کا دیکھتے دیکھتے منقلب ہو جانا اور نازونعم' شوکت و حشمت' جاہ وجلال اور عزت و مرتبت کے بجائے ان کی بے بسی اور لاچاری' فقروفاقہ ' اس کے ساتھ ہی سفلوں اور کمینوں کا صاحب توقیر ہو جانا اپنے اندر حیرت و عبرت کا بڑا سامان رکھتا ہے۔

مٹا ہے نامِ شاہی ہند سے اس درجہ ان روزوں
نہیں ممکن کہ اب بانات بھی کہلائے سلطانی
جو کچھ مزدور تھے وہ آج ٹھہرے راج کے مالک
جو شب کو مہترانی تھی ہوئی دن کو مہارانی
ہوا چترِ ہما' عنقا سے بھی معدوم ان روزوں
پڑے ہیں دھوپ میں محتاجِ سایہ' ظلِّ سبحانی
پڑے ہیں ٹھوکروں میں کاسۂ سر بادشاہوں کے
الٰہی روئے کسی کا سر پکڑ کر تاجِ سلطانی
کسی نے کوڑیوں کے مول بھی پوچھا نہ ان روزوں
چڑھی نیلام پر سلطانی و نوابی و خانی

سیہ کاروں کے سر پر افسرِ عزت نظر آئے
بنے ہیں مرغِ عیسیٰ ان دنوں مرغِ سلیمانی
کیا زاغ و زغن نے آشیانہ چتر منزل پر
سرِ تختِ ہما ہیں بوم صرفِ بال افشانی
پڑے ہیں خاک پر شاہانِ عالم واہ ری قسمت
کمینے ٹھوکروں سے توڑتے ہیں تختِ سلطانی
خوشی کے دن بھی عریاں تھے امیرانِ فلک رفعت
ہلالِ عید کرتا کس کے جامہ کی گریبانی
کہاں کا دانۂ گندم' نہ پائی جو کی بھوسی تک
خواتینِ عظیمہ نے اگرچہ خاک بھی چھانی
چنے کھانے کو ترسیں صاحبانِ گوہرِ عالی
صدف کو دے نوالہ موتیوں کا ابرِ نیسانی (۱۳۴)

لکھنؤ کی عام تباہی' عمارتوں کے انہدام اور قیصر باغ کی ویرانی اس قصیدہ میں اس طرح بیان کی ہے۔

محل سونے کے ٹوٹے' کھد گئے ایوانِ مینائی
بنا ہے کہنہ گورستاں کی صورت قصرِ سلطانی
گلستانِ ارم میں دھوم ہے مرگھٹ کی دعوت کی
تکلف سے ہے قیصر باغ میں گھورے کی مہمانی (۱۳۵)

انگریزوں کے مظالم اور حریت پرستوں کے وحشیانہ قتل عام سے ایک عام ویرانی زندگی کا مقدر بن چکی تھی۔ خون انسانی کی یہ ارزانی تھی کہ سڑکیں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے ان کو خوبصورت بنانے کیلئے ان پر سرخی کوٹ کر بچھا دی گئی ہو۔ کوئی فرد ایسا نہیں جس کا کوئی عزیز اس ہنگامۂ دارو گیر میں کام نہ آیا ہو۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس سے ماحول کی ویرانی پر خون کا آنسو نہ ٹپکا

زمانہ کا پتہ ملتا نہیں معدوم ہونے سے
مسافر ڈھونڈتے ہیں اب سرائے عالمِ فانی
جہاں دیکھو سڑک پر مجمعِ وحشت کی کثرت ہے
نظر آتا ہے ہر میلہ میں انبوہِ پریشانی
کوئی دریا میں گریاں ہے کوئی خشکی میں بے ساماں
اب اس میں نوحِ طوفانی ہو یا ہو نوحِ سامانی (۱۳۶)

اور یہ ہے عام قتل اور پھانسیوں کی تصویر جس کے نتیجہ میں عام خوف وہراس اور سراسیمگی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

ملا ہے عہدۂ خورشید شاید سعدِ ذابح کو
کہ لاکھوں ہر سحر تلوار سے ہوتے ہیں قربانی
قضا جتنی معلق تھی وہ مبرم ہو گئی اب کے
لٹک کر پھانسی میں جاتی رہی بنیادِ انسانی
کٹی سرخی سڑک پر جانتے ہیں دیکھنے والے
ہوا ہے خونِ ناحق سے یہ فرشِ خاک' افشانی
کہاں کی دایہ' آغوشِ لحد میں اب وہ سوتے ہیں
فلک کرتے تھے جن اطفال کی گھوارہ جنبانی
اگر اس وقت میں ہوتے تو ڈر سے چھینکتے پھرتے
جنابِ میرزا خانی' متاعِ خان خانانی (۱۳۷)

یہ تصویریں بڑی ہی حقیقت پسندانہ ہیں جن کی تصدیق اس عہد کے بارے میں لکھی جانے والی دوسری تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔ کمال الدین حیدر نے "قیصر التواریخ" میں اس طرح دہلی میں قتل وغارت گری پر خون کے آنسو روئے ہیں۔

"۳۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پوری دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اسی دن جامع مسجد بھی

انگریزوں کے قبضہ میں آئی- مسجد کے صحن میں مسلمانوں کو قتل کیا- گورے شہر کی گلیوں اور کوچوں میں پھیل گئے- مکانوں کے دروازے توڑ کر اندر گئے' سینکڑوں عورتیں اپنی عفت و عصمت کو بچانے کیلئے کنوؤں میں گر گئیں- جہاں عورتوں' بچوں اور مردوں کو پایا قتل کیا- جب یہ حال اہل شہر نے دیکھا کہ اب جان اور عزت پر بن آئی ہے' ان کی حفاظت ممکن نہیں ہے تو خوب دل کھول کر لڑے' نو بجے سے بارہ بجے تک یہی حال رہا- ہر طرف لاشوں سے گلیاں بھر گئی تھیں- خون برسات کے پانی کی طرح بہنے لگا تھا- ستائیس ہزار عام مسلمان اور آٹھ ہزار فوج کے لوگ شہید ہوئے-(۱۳۸)

منیر کے دیوان سوم میں ایک غزل ہے جس کے کل ۴۹ اشعار ہیں- یہ غزل ۱۸۵۷ء میں ہونے والی تباہی کا نوحہ ہے- ان شعروں سے بربادی کی پوری تفصیل اور اس عہد کی بدلی ہوئی حالت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے- یہاں خوف طوالت سے کچھ منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں-

دل تو پژمردہ ہیں' داغِ غم گلستاں ہوں تو کیا
آنکھیں روتی ہیں' دہانِ زخم خنداں ہوں تو کیا

لاکھوں گل رُو داغِ حسرت لے گئے زیرِ زمیں
باغِ عالم میں اگر دو پھول خنداں ہوں تو کیا

ہو گئے برباد شاہانِ سلیماں مرتبت
اب بلائیں ہوں تو کیا' دنیا میں پریاں ہوں تو کیا

پڑ گئے پتھر جواہر پوشوں پر اے آسماں!
کوڑیوں کے مول اب لعلِ بدخشاں ہوں تو کیا

بیگمیں' شہزادیاں پھرنے لگیں خانہ خراب
سب چڑیلیں صاحبانِ قصر و ایواں ہوں تو کیا

ہو کے محتاجِ کفن مر مر گئے زریں لباس
خلعتِ زیبا نصیبِ شخصِ عریاں ہوں تو کیا

گیسوؤں والے تو لاکھوں ہو گئے پیوندِ خاک
ان کے مرقد سے جو پیدا سنبلستاں ہوں تو کیا

جو دوشالے دیتے تھے کملی بھی اب پاتے نہیں
پاجیوں کو قاقم و سنجاب ارزاں ہوں تو کیا

مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں، صومعہ ویران ہیں
یادِ حق میں ایک دو دل ہائے سوزاں ہوں تو کیا

لٹ گئے قصرِ مرصع، کھد گئے زریں محل
رنج سے معمور اگر دل ہائے ویراں ہوں تو کیا

نور کی خلوت میں پریاں ناچتی تھیں جس جگہ
اس جگہ مشعل بکف، غولِ بیاباں ہوں تو کیا

دانہ دانہ کے لئے محتاج ہیں عالی گہر
اشکِ حسرت اپنے مروارید غلطاں ہوں تو کیا

صوفیانِ صاف طینت واصلِ حق ہو گئے
خود نما دو چار ننگِ اہلِ عرفاں ہوں تو کیا

کاملوں کو کر دیا برباد تو نے اے فلک!
چند نالائق ترے ممنونِ احساں ہوں تو کیا

جاں بلب ہیں غم سے استادانِ فنِّ نظم و نثر
مطمئن اس عہد میں دس بیس ناداں ہوں تو کیا

بھیڑیوں سے بچ رہے جو چند یوسف اے فلک!
خانماں برباد اسیرِ بند و زنداں ہوں تو کیا

پیشوایانِ رہِ دیں ڈر سے ہیں عزلت گزیں
گنج کی مانند ویرانوں میں پنہاں ہوں تو کیا

نوحہ گر ہیں قاضیان و مفتیانِ اہلِ عدل
چند نامنصف پناہِ اہلِ دوراں ہوں تو کیا

تعزیہ خانوں میں خاک اڑتی ہے، چلتی ہے شراب
غم سے آنکھیں صورتِ زخمِ شہیداں ہوں تو کیا
قدر دانِ شاعری و شعر پھرتے ہیں خراب
صاحبِ دیواں اگر اب کے سخن داں ہوں تو کیا
بے کفن وہ ہیں کہ شانِ میرزائی جن میں تھی
سوگ میں صد چاک، دامان و گریباں ہوں تو کیا
سخت جان و بے حیا دو چار ہم سے جو رہے
ہر گھڑی پابندِ خوفِ عزت و جاں ہوں تو کیا

اور یہ ہے اس غزل پر منیر کا اپنا تبصرہ۔

یہ غزل ہے حسبِ حالِ دہر، مثلِ قطعہ بند
ست جیتیں صورتِ خوابِ پریشاں ہوں تو کیا (۱۳۹)

اسی دور کی ایک اور یاد گار غزل بھی ہے۔ اس غزل میں منیر نے ایک قطعہ بھی کہہ کر شامل کیا ہے۔ یہ قطعہ عبرت کی ایک ایسی تصویر ہے جس سے شاعر کے دل کی گہرائیوں تک اترتے ہوئے اس زہر غم کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں جو زمانہ کا ورق الٹنے سے اس کے جان ودل میں سرایت کر چکا تھا۔ اس قطعہ میں عہد گزشتہ کی ایک ایک خوبصورت تصویر بڑی مہارت سے کھینچی گئی ہے اور پھر بیک جنبش ان تمام متحرک اور رنگین تصویروں پر جیسے زمانے کے ظالم ہاتھ نے کالک پھیر دی ہو۔ یہ قطعہ چوبیس اشعار پر مشتمل ہے۔ آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے۔

جس بزمِ جاں فزا میں ابھی کل کی بات ہے
خالی سرور سے دلِ پیر و جواں نہ تھا
فرشِ نفیس، دامنِ نظارہ سے لطیف
ذی رتبہ میرِ فرش سے تاجِ شہاں نہ تھا
فانوسیں تھیں گلوئے پریزاد سے سوا
روشن تھیں صاف نور کی شمعیں، دھواں نہ تھا

ہر روشنی تھی برقِ تجلّی سے آشنا
بیگانہ شمعِ طور سے اک شمع داں نہ تھا

پھولوں کی ہر طرف تھیں ہزاروں مسہریاں
بیدار بخت خوابِ مسرّت کہاں نہ تھا

میوہ کی ڈالیاں کہیں پھولوں کی ڈالیاں
سرسبز جن کے سامنے باغِ جناں نہ تھا

آبِ گہر کی موج تھی ہر نہر سے بلند
فوّارہ وہ نہ تھا کہ جو گوہر فشاں نہ تھا

وہ ناچ سحر کا وہ بتانا طلسم کا
وہ بھاؤ تھے کہ نرخِ مسرّت گراں نہ تھا

پریوں کے جھنڈ تھے، کہیں جھرمٹ حسینوں کے
محبوب جن کے آگے، مہِ آسماں نہ تھا

چھائے ہوئے تھے چپٹی رنگوں کے قہقہے
جن سے شگفتہ تر چمنِ زعفراں نہ تھا

چٹکی بجا بجا کے بلاتے تھے عیش کو
گانے کی دھوم تھی، کہیں نامِ فغاں نہ تھا

بانہیں گلے میں تھیں، کہیں طوقِ کمر تھے ہاتھ
ایسا پری معانقۂ جسم و جاں نہ تھا

وہ بزم دل فریب تھی ایسی کہ رات بھر
رنج و ملال کے لئے رستہ جہاں نہ تھا

دیکھا اسی طلسمِ خوشی کو جو صبح دم
جز چغد اور کوئی وہاں نوحہ خواں نہ تھا (۱۴۰)

ہر چند یہ بزم عیش ونشاط جس کا نقشہ منیر شکوہ آبادی نے اس قطعہ میں کھینچا ہے اپنے وسیع تر مفہوم میں عام لکھنوی معاشرت کا اشاریہ ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس بزم طرب کی تصویر کشی میں شاعر کے سامنے غیر شعوری طور پر واجد علی شاہ کی کتاب زندگی کے روشن اور تاریک دونوں ورق رہے ہوں- ڈاکٹر نعیم احمد نے ایک شہر آشوب کے ادبی محاسن بیان کرتے ہوئے جن خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ تمام وکمال منیر کے یہاں موجود ہیں- ڈاکٹر نعیم احمد لکھتے ہیں-

"شہر آشوب زندگی پر تبصرہ بھی ہے اور تنقید بھی- یہ نظمیں خیال آرائی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس دور کے حالات کی تخلیق ہیں' اس لئے یہ صنف سخن اپنے ماحول کی عکاس ہے اس میں سیاست' معاشیات اور روزمرہ زندگی کے حالات و واقعات شعریت کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں- اس کی اہمیت اور عظمت کا راز یہ ہے کہ اس کے بیان میں صداقت' گیرائی' گہرائی' سادگی اور پُرکاری ہے اور فنی عناصر کی صرف اس حد تک آمیزش کی گئی ہے کہ ذہن جمالیت اور فن کاری میں گم ہو جانے کی بجائے واقعیت اور حقیقت کی طرف ملتفت ہوتا ہے-" (۱۴۱)

قیامِ انڈمان

منیر شکوہ آبادی نے کالے پانی میں پانچ برس کی مدت بسر کی- وہ وہاں جولائی ۱۸۶۰ء مطابق محرم ۱۲۷۷ھ کی کسی تاریخ کو پہنچے اور ۸ جولائی ۱۸۶۵ء مطابق ۱۳ ماہ صفر ۱۲۸۲ھ کو وہاں سے رہائی پائی- کالے پانی کی سزا عموماً" ان مجرموں کو دی جاتی تھی جن کے الزامات کی نوعیت انتہائی سنگین ہوتی تھی اور یہ سزا کی آخری حد تھی- انقلاب زمانہ دیکھئے کہ ان ایام میں یہ سزا ان محبان وطن کو دی گئی جو برصغیر کے بہترین دل ودماغ تھے- ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اپنی سرزمین پر غیر ملکیوں کے تسلط کو ختم کر دینے کے آرزومند تھے- منیر سمجھتے تھے کہ حکومت نے ان کو اس سزا کا مستحق قرار دیکر کوئی انصاف نہیں کیا-

سزا جو ظالموں کو دی وہ حق تھی' چشمِ ما روشن
مگر ہم سے غریبوں کی عبث کی خانہ ویرانی (۱۴۲)

منیر نے یہ مدت پورٹ بلیر میں گزاری جو انڈمان کی بندرگاہ ہے- یہ جزائر خرابیٔ آب وہوا کی بدولت ایک بار آباد ہو کر ویران ہو چکے تھے- جب جنگ آزادی کے بعد مجاہدین کی ایک کثیر تعداد کو سزا دینی مقصود ہوئی تو ان جزائر کی قسمت پھر جاگ اٹھی' چنانچہ مارچ ۱۸۵۸ء سے دوبارہ ان جزائر کی آباد کاری کا کام شروع ہوا(۱۴۳)- اس اعتبار سے منیر نے جب اس خاک سیاہ پر قدم رکھا تو یہ جزیرہ چند برس پہلے ہی دوبارہ آباد ہوا تھا- منیر یہاں اپنی آمد پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں-

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا
زہرِ غربت' شکر فروشوں کو ملا
جب لختِ جگر کھا کے لگی پیاس منیر
کالا پانی سفید پوشوں کو ملا (۱۴۴)

منیر پورٹ بلیر میں سپرنٹنڈنٹ وکمشنر کے دفتر میں محرر تھے- منشی محمد رضا معجز کے نام ایک خط میں وہ اپنا پتہ اس طرح لکھتے ہیں-

"ایں عبارت بر سرنامہ جواب ایں کلپرہ باید نگاشت' انشاء اللہ تعالیٰ در کلکتہ رسیدہ از آں جا بہ جزیرہ پورٹ بلیر انڈمان بہ کچہری سپرنٹنڈنٹی وکمشنری نزد فلاں منشی برسد واز و بدو وصول"(۱۴۵)

منشی لوگ وہاں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور ان سے محنت ومشقت کا کام نہیں لیا جاتا تھا- چنانچہ کمشنر کے دفتر میں قیدیوں کی وفات ان کے جرائم کی نوعیت' قید کی مدت' رہائی کی تاریخ غرض ہر قسم کے کوائف درج کرنا منیر کے فرائض میں شامل تھا-

ہر چند محاسبوں میں کم وقعت ہیں
پر قیدیوں کے کفیلِ کیفیت ہیں
لکھتے ہیں رہائی و اسیری سب کی
ہم نقل نویسِ دفترِ قسمت ہیں (۱۴۶)

جن دنوں محکمہ گورنری کو ان کوائف پر مشتمل سہ ماہی رپورٹ روانہ کی جاتی تھی، منیر بے اندازہ مصروف رہتے تھے جیسا کہ ان کے ایک خط کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے۔ اپنے شاگرد محمد وزیر خاں کے نام جنھوں نے منیر سے ان کے تازہ اشعار کی فرمائش کی تھی، جواباً" لکھتے ہیں۔

"انچہ خواستد اشعار من شدہ آید جان شما کہ دریں زماں فرصت سرخاریدن محالات است زیرا کہ نقشہ سہ ماہی مشتمل بر فوت و فرار و رہائی بازپس رفتن باضلاع بابتہ جملہ اسیران و تعداد صحیحہ باقی ماند گان از ذکور و اناث از جنوری لغایت آخر مارچ سنہ حال وشرح اقسام قیدیاں از دوام حبس و میعادیاں سنین متطاولہ و یکسالہ حسب ضابطہ می نویسم کہ بہ محکمہ گورنری فرستادہ آید حالیا معذورم دارند"(۱۴۷)

ابتدا میں منیر کو چھ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی، دو روپے سالانہ ترقی پاکر پہلے یہ تنخواہ آٹھ روپے اور پھر دس روپے ہو گئی۔

پہلے ہوئی چھ روپے ہماری تنخواہ
پھر آٹھ سے دس ہوئی خدا ہے آگاہ
ننانوے کا پھیر رہا قید میں بھی
لاحول ولا قوۃ الا باللہ (۱۴۸)

ہر چند منیر وہاں یک و تنہا تھے اور پھر اس زمانہ میں دس روپے ماہوار تنخواہ کچھ ایسی کم بھی نہ تھی جس میں ایک متوسط درجے کا شخص کسی حد تک بسر اوقات نہ کر سکتا ہو مگر منیر نے چونکہ اپنی عمر کا بیشتر حصہ امراء کی محفلوں میں گزارا تھا جہاں استاد ہونے کے سبب ان کا احترام بہت زیادہ کیا جاتا اور ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا یہ امراء اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان ملازمتوں کے دوران منیر کو ہر طرح کا آرام و آسائش حاصل تھا چنانچہ وہ ان لوازمات حیات کے عادی ہو گئے تھے، اس کے علاوہ ان کو بعض ایسی عادات بھی پڑ گئی تھیں جن کا پورا ہونا اس عسرت میں ممکن نہ تھا۔ ان کو یہاں یا تو وہ عادات ترک کرنا پڑیں یا پھر مجبوری کی حالت میں جیسے بھی بن پڑا گزارا کرنا پڑا۔ منیر

تمباکو نوشی کے عادی تھے مگر یہاں اچھا تمباکو نہیں ملتا تھا۔ حقے کا نیچا ٹوٹ جاتا تو معمولی حقے انہیں پسند نہیں آتے تھے، چنانچہ خود اپنے ہاتھ سے نیچے کی مرمت کرتے تھے۔

دم ناک میں عسرت سے مرا ہو کب تک
حقہ نہ ملے پینے کو اچھا کب تک
تا چند لپیٹوں دھجیاں نیچے پر
بدلا کروں پوست استخواں کا کب تک (۱۴۹)

ہر چند یہ تمباکو نوشی ان کی زندگی کی بنیادی ضرورت نہ تھی مگر منیر اس عالم غربت میں کیا کرتے۔ اس شغل میں وہ وقتی طور پر اپنے دکھوں اور محرومیوں کو بھول جاتے۔ یہاں سب کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا۔ انہوں نے بھلا کب چولہا جھونکا تھا مگر جب بھوک ستاتی تو مجبوراً خود ہی کھانا پکانا پڑتا تھا۔ (۱۵۰)

یہاں کی زندگی کی اذیت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کو ایک ٹھنڈے چبوترے پر بغیر بستر کے سونا ہوتا۔ شدائد زمانہ نے ان کو گھلا دیا تھا جس کے سبب ہڈیاں نکل آئی تھیں، اس لئے سخت زمین پر لیٹنا کچھ اور بھی تکلیف دہ محسوس ہوتا۔ ذہنی کوفت اور عہد عیش کی یادیں جب دل و دماغ پر محیط ہوتیں تو نیند ایک زخمی پرندے کی طرح اس پر شور جزیرے میں رات بھر پھڑپھڑاتی رہتی اور ان کی تمام رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزر جاتی۔(۱۵۱)

منیر انڈمان پہنچے تو جسم پر لباس خستہ و خراب ہو چکا تھا جو پوری طرح تن ڈھانپنے کے لئے بھی کافی نہ تھا۔ ان دنوں منیر جیسے صاحب علم اور وضعدار شخص کے دل و دماغ کی کیا حالت ہوگی اس کا اندازہ کچھ ان رباعیات سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اس موضوع پر ان دنوں لکھیں۔ منیر نے جب اپنے لباس کی شکایت حکام سے کی تو ان کو پہننے کے لئے وہ کپڑے دیئے گئے جو وہاں عام قیدیوں کو ملتے تھے۔ یہ لباس منیر کے نقطۂ نظر سے قطعی طور پر خلاف وضع تھا کیونکہ پاجامے کے پائنچے اس قدر تنگ اور چھوٹے تھے کہ اس کے پہننے سے جسمانی اذیت کے ساتھ ایک ذہنی کوفت بھی ہوتی تھی۔(۱۵۲)

دو سال کی مدت اسی اذیت میں بسر ہوئی۔ مرزا ولایت حسین خان سابق وزیر باندہ بھی یہاں

موجود تھے جو منیر ہی کی طرح جرم بغاوت میں سزا کاٹ رہے تھے۔ انھوں نے جب منیر کی یہ حالت دیکھی تو ان کو اس ذہنی وجسمانی اذیت سے نجات دلانے کے لئے بہت کوشش سے اپنے پاس سے نئے کپڑے بنوا دیئے۔ یہ واقعہ ۱۲۷۹ھ کا ہے۔ منیر غربت میں ان کے اس خلوص اور حق رفاقت کی ادائیگی سے بہت خوش ہوئے مگر ان کی یہ خوشی کچھ زیادہ دیر پا ثابت نہ ہو سکی۔ انڈمان چوروں اور ہر قسم کے جرائم پیشہ افراد کا گڑھ تھا جو یہاں بھی خبیث عادات سے باز نہ آتے اور موقع ملتے ہی دوسروں کا مال اس طرح لے اڑتے کہ کسی کو خبر تک نہ ہوتی۔ چنانچہ ابھی یہ نئے کپڑے ایک آدھ بار ہی پہنے ہوں گے کہ چور ان کو لے اڑے۔

برہنگی میں مگر سب سے تھی سوا تکلیف
وبالِ دوش ہوا تھا لباسِ انسانی
شفیقِ بندہ ولایت حسین مرزا نے
کہ ہیں وہ دوست قدیمی' برادرِ جانی
بنا دیئے مجھے کپڑے بڑے تردد سے
چھپا دیئے مرے بالکل عیوبِ جسمانی
ہنوز صرف میں بھی اس قدر نہ آئے تھے
چرا کے لے گئے غارت گرانِ زندانی (۱۵۳)

اس جزیرے میں ہر قسم کے لوگ آباد تھے جن میں جاہل' اجڈ اور صاحب علم کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ بیشتر لوگ وہ تھے جو اخلاقی جرائم کی پاداش میں یہاں زندگی گزار رہے تھے۔ ان لوگوں کے درمیان شب وروز بسر کرنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی انسان جنات اور بھوتوں میں پھنس جائے۔ منیر اس بارے میں رقم طراز ہیں۔

"مکشوف ضمائر قدسی نفساں سخن رس باد کہ درالوف ضیق مجال وتشتت حال وصنوف توزع بال کہ ازاں جملہ نوائب اسیری و شدائد غربت و بالاتر ازاں ہمہ ابتلاء صحبت عوام کالانعام بل ہم اضل سبیلا کہ ناگزیر مجالس و سجون انگریزیہ است خدایا نصیب احدے مباد" (۱۵۴)

گویا منیر کو جن لوگوں کے ساتھ انڈمان میں وقت گزارنا پڑا وہ ان کو وحشیوں اور جانوروں سے بھی گیا گزرا سمجھتے ہیں ان کی نفاست پسند طبیعت پر انڈمان میں کیا گزری اس کا حال ان سطور سے واضح ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء کی یہاں بڑی قلت تھی۔ گوشت کا تو کیا ذکر روٹی دال کا مل جانا خوش قسمتی تصور کیا جاتا تھا۔ اگرچہ ہزاروں گندمی رنگ یہاں پس پس کر موت سے ہم کنار ہو چکے تھے لیکن بقول منیر گندم کا آٹا پھر بھی نایاب تھا۔ اکثر ارہر کی دال اور چاول کھانے کو ملتے، میٹھی چیزوں کا تو کیا ذکر شکر اور گڑ تک نایاب تھا البتہ شکر کے بدلے ساحل کی ریت باافراط تھی۔ نمک سمندر کے پانی سے بنایا جاتا تھا لہٰذا وہ انتہائی کڑوا اور کسیلا ہوتا تھا۔ ایک صاحب خالص دودھ کا تحفہ کبھی کبھی ان کو ضرور بھیجتے رہتے تھے جن کا نام رحم علی خاں تھا، منیر نے بعض اشعار میں ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔(۱۵۳) یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ صاحب کون تھے اور منیر سے ان کے تعلق کی قدر مشترک کیا تھی۔ صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ رحم علی خان باندہ کے رہنے والے تھے۔ منیر جن دنوں وہاں قید وبند کی سختیاں برداشت کر رہے تھے، رحم علی خاں حسب ہمت ان کی کفالت کرتے رہتے تھے۔

انڈمان چند برس پہلے تک غیر آباد تھا، یہی وجہ ہے کہ وہاں حشرات الارض کی کثرت تھی جس سے ہر وقت جان کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ بچھو، سانپ اور دوسرے زہریلے جانور یہاں باافراط پائے جاتے تھے۔ صبح شام مینڈکوں کا شور نیند حرام کئے رکھتا۔ ان جزائر کا موسم انتہائی خراب تھا۔ تین ماہ شدید گرمی پڑتی، باقی دنوں میں پانی برستا رہتا اور حبس کی کیفیت قائم رہتی۔ گرمی یہاں اس قدر شدید پڑتی تھی کہ انگریز بھی یہاں آکر کالے پڑ جاتے تھے۔ بیماریوں کا یہ حال تھا کہ اگر کسی کو بخار آجاتا تو ساری طاقت زائل ہو جاتی۔ مرطوب آب وہوا کے سبب اکثر لوگ خارش کی تکلیف میں مبتلا رہتے تھے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی جو منیر کے ہمراہ انڈمان میں جرم بغاوت کی سزا بھگت رہے تھے، ان جزائر میں امراض کی شدت کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"یہ ناقابل برداشت حالات تھے کہ میں متعدد امراض میں مبتلا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے میرا صبر مغلوب، میرا سینہ تنگ، میرا چاند دھندلا اور میری عزت ذلت سے بدل گئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس دشوار وسخت رنج وغم سے کیوں کر چھٹکارا حاصل ہو سکے گا۔ خارش اس پر مستزاد ہے۔ صبح وشام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے

چھلنی ہو چکا ہے۔ روح کو تحلیل کر دینے والے درد و تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب یہ پھنسیاں مجھے ہلاکت کے قریب پہنچا دیں"۔ (۱۵۶)

چنانچہ منیر کو بھی یہ عارضہ خارش لاحق ہو گیا۔ ایک طرف کام کی زیادتی دوسری طرف خارش قلم چلانے میں رکاوٹ' ان دنوں دفتر کا کام کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

تحریر کچہری سے تو پنجہ سُن ہے
کھجلائیں گے خارش کو برابر دُھن ہے
کیوں کر لکھنے میں جسم کھجلاؤں' منیر
افسوس' انگشتِ خامہ بے ناخُن ہے (۱۵۷)

اور اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ دوا کا قحط تھا جس سے اموات عام تھیں۔ اس مدت میں منیر بھی بیمار پڑے مگر ان کا یہ یقین کہ آٹھویں امام اس علالت میں ان کی خبر گیری سے بے خبر نہیں ہیں' اس مشکل وقت میں کام آیا اور منیر ہر ابتلا سے سر اٹھائے ہوئے گزر گئے۔ وہ ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں۔

اس قید میں ضامن ہیں فقط حضرتِ ثامن
کیا غم ہے منیر آپ جو بیمار پڑے ہیں (۱۵۸)

عیش و آرام کا زمانہ آنکھ جھپکتے گزر جاتا ہے مگر مصیبت کے دن کاٹے نہیں کٹتے' یہی حال انڈمان میں منیر کا بھی تھا۔ وہ یاد عزیزاں سے دل گیر ہوتے تو حضرت علی کرم اللہ وجہ سے مدد کی خواستگاری کرتے تھے۔

نہایت ہے منیر افسردہ دل طولِ اسیری سے
مدد کو یا علی پہنچو دمِ مشکل کشائی ہے (۱۵۹)

ان لمحات میں ان کو اپنے رفقاء' مربّی اور شاگرد بہت شدّت سے یاد آتے تھے جو اگر قریب ہوتے' تو ان ایّام میں ان کی دیکھ بھال ضرور کرتے۔ یہ خیال آتا تو ان کا دل ناتواں تڑپ تڑپ

کر رہ جاتا۔ الہ آباد کے دوستوں اور شاگردوں کو جن میں میر غلام عباس اور علی عباد نیساں بھی شامل تھے اس طرح یاد کیا ہے۔

کیا الہ آباد کے احباب یاد آئے منیر
کیوں ہوا بتیاب بسمل کی طرح اک بار دل (۱۶۰)

انڈمان کی زندگی سوائے اس کے کہ وہاں سے رہائی ممکن نہ تھی دوسرے معاملات میں اسیر عام لوگوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے، چنانچہ مولانا جعفر تھانیسری مولف ''کالا پانی'' نے اپنے قیام انڈمان کے دوران متعدد شادیاں کیں اور گھر آباد کر کے وہاں زندگی گزاری (۱۶۱) یہاں جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے والوں کے اعزاء ہندوستان سے جو خطوط اور سامان ان ستارہ سوختگان کے لئے بھیجتے تھے وہ برابر ان کو ملتا رہتا تھا۔ منیر نے منشی محمد رضا معجز کو اس صورت حال سے ایک خط میں اس لئے باخبر کرنا ضروری سمجھا کہ کہیں وہ اس خیال سے کہ اسیروں کے ساتھ خط وکتابت ممنوع ہے، ان کو خط کا جواب ہی نہ لکھیں اور یوں منیر کو اپنے بعض کرم فرماؤں کی خیریت اور معاملات سے آگاہی حاصل نہ ہو سکے۔ منیر انڈمان میں رہنے والوں کی حالت کے بارے میں اس خط میں لکھتے ہیں۔

''باید دانست کہ از تحریر جواب ایں نگاشتہ نیاز انباشتہ بتو ہم کذائی از جا نروند کہ منیر اسیر است وکتابت باسیراں ممنوع وحاشا کہ چنیں بودہ باشدچہ از مختصات اسیران ایں جزیرہ است کہ درجملہ امور مساہم ومضاہی آزاداں می باشند الا رہائی و ہموارہ خطوط زندانیان بنام ہندوستانیان وکذا بالعکس وادی آمدوشد در ڈاک سرکاری می پیاید از آں جملہ پیوستہ مکاتبات اکثرے از تلامذہ و اصدقاء ایں کس مپرس مع بضاعت مرجائیکہ دریں جا بکار معاش آید، بوساطت اہل ڈاک بحمد اللہ بمن می رسد'' (۱۶۲)

وہ جب فرصت کے اوقات میں ایام گزشتہ پر نظر ڈالتے تو گزرے ہوئے چھ سات برس ایک خواب پریشاں کی طرح دکھائی دیتے۔ اتنی قلیل مدت میں حالات کا اس قدر تبدیل ہو جانا کسی انقلاب سے کم نہ تھا۔ زمانہ کی ہوا نے بیاض کے اوراق اس طرح پریشان کر ڈالے تھے کہ ان کی شیرازہ بندی اب ان کے اختیار میں نہ تھی۔

چھ سات برس میں یہ قیامت

تم بھی کوئی تیرھویں صدی ہو

کیا لطف دکھائے اے جوانی

اللہ کرے تو جنتی ہو

ان روزوں منیر ہے پریشاں

مشکل آسان یا علی ہو (۱۶۳)

انڈمان کی اذیت ناک زندگی کیسی ہو گی' اس کا اندازہ منیر کے صرف ایک فقرے سے لگایا جا سکتا ہے- یہ جملہ اس خط کا حصہ ہے جو انہوں نے مارچ ۱۸۶۴ مطابق شوال ۱۲۸۰ھ میں شباب فرخ آبادی کے نام لکھا- لکھتے ہیں-

"حالم پرسیدنی و شنیدنی ندارد- اثر صحیح الجلاء اعظم البلاء نکتہ ایست کہ دفاتر ما نحن فیہ در کنار دارد ولا یجدی بہ نفعا" "(۱۶۴)

یعنی میرا حال نہ پوچھنے والا ہے اور نہ سننے والا- جلا وطنی ایک بڑی مصیبت ہے- یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس کو بیان کرنے کے لئے دفتر چاہئیں مگر اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں- اس جزیرہ کی تکلیف دہ زندگی کے بارے میں ایک اور بلیغ جملہ منیر نے اپنے اس خط میں لکھا ہے جو انہوں نے اگست ۱۸۶۴ء (ماہ ربیع الاول ۱۲۸۱ھ) میں منشی محمد رضا معجز کو کان پور کے پتے پر تحریر کیا- فرماتے ہیں-

"جزیرہ موحشہ جعل اللہ عالیھا سافلھا"(۱۶۵)

یعنی یہ وہ وحشت ناک جزیرہ ہے جس کی اعلیٰ ترین چیزیں بھی اسفل ہیں- اپنے ایک اور خط میں جو انہوں نے ۲۳ مارچ ۱۸۶۴ء (۱۴ شوال ۱۲۸۰ھ) کو اپنے شاگرد محمد وزیر خان ساکن باندہ کے نام روانہ کیا' لکھتے ہیں-

حالم در معمورۂ زنداں از ہمگناں پنہاں و بر علام الغیوب عیاں است' دشمن کای را نصیب دوستاں گویم دوست کای را بالعکس' آں علاقہ جاں بکالبد محض از عجائب صنائع ایزد

توانا است والا

بزنداں دیدہ ام حالے کہ کافر از اجل بیند
خدا کوتاہ سازد عمرِ ایآمِ جدائی را

درغرفہ وہان اژدر نشتہ ام و بہ آغوش کام شیر باآرام خوابیدہ خلاصہ چہ گویم وچہ بنگارم

مارا زبانِ شکوہ ز بیدادِ چرخ نیست
از ما خطے بہ مہرِ خموشی گرفتہ اند" (۱۶۶)

منیر نے جزائر انڈمان میں گزرنے والے اپنے شب وروز کو تفصیل سے اپنی نظم ونثر میں بیان کیا ہے جس کی تصدیق امپریل گزیٹیر آف انڈیا سے بھی ہوتی ہے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے کہ ۱۸۷۰ء میں جبکہ شرح اموات نسبتاً" کم ہو گئی تھی' ۷۴۶۰ قید کاٹنے والے باشندوں میں سے روزانہ ۳۹۸ افراد بیمار پڑتے جس میں مرنے والوں کی تعداد ایک فی صد سے زائد ہوتی۔ منیر ۱۸۶۵ء تک وہاں مقیم رہے۔ جو اعداد و شمار گزیٹیر میں فراہم کئے گئے ہیں ان سے یہ اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کہ ان ایام میں بیماری سے مرنے والوں کی تعداد ۱۸۷۰ء کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہوگی وہاں کے رہنے والے عموماً" بخار' زکام' پھیپھڑوں کے امراض 'پیٹ کی بیماریوں' درد سر' دانت کے درد اور ریاحی درد میں مبتلا رہتے تھے۔

انڈمان کے بارے میں گزیٹیر سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کی آب وہوا بہت مرطوب ہے۔ یہ جزائر قطعی طور پر جنوب مغربی مون سون کے بھرپور حملوں کی زد پر ہیں۔ صرف چار مہینے موسم کے اعتبار سے یعنی فروری سے مئی تک کسی قدر بہتر ہوتے ہیں۔ بارشیں جون سے ستمبر تک لگاتار ہوتی رہتی ہیں۔ اکتوبر سے جنوری تک جو موسم ہے اس کو معتدل کہا جاسکتا ہے۔ ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۲ء تک چار برس میں بارشوں کی سالانہ اوسط ۱۰۰٫۶۹ سے ۱۵۵٫۶۷ انچ سالانہ رہی۔ گرمی بھی شدید پڑی اور درجۂ حرات ۸ ڈگری فارن ہائیٹ رہا۔(۱۶۷)

جزائر انڈمان میں جو دوسرے علماء وفضلا قید وبند اور غریب الوطنی کے صدمات برداشت کر

رہے تھے ان میں مولانا فضل حق خیر آبادی کے علاوہ منشی خوشی رام اور مولوی مظہر کریم بھی تھے۔ یہ لوگ ان حالات میں حسب توفیق تصنیف و تالیف کے کام میں بھی مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ مولانا فضل حق خیر آبادی کی مشہور تصنیف " الثورۃ الہندیہ " انہی ایام کی یاد گار ہے۔ صاحب علم و فضل ہونے کے سبب منشی خوشی رام سے منیر کے دوستانہ مراسم استوار ہو گئے تھے۔ چنانچہ خوشی رام نے منیر کے انڈمان پہنچنے کے چند ماہ بعد جزائر انڈمان کی تاریخ "تاریخ انڈمن" کے نام سے ۱۲۷۷ھ یعنی ۱۸۶۱ء میں تالیف کی۔ یہ کتاب خاصی معلومات افزا تھی اور اس میں جزائر دریائے شور کی تمام روداد قلم بند کی گئی تھی۔ منیر نے اس کتاب کی تصنیف پر متعدد قطعات تاریخ موزوں کیے۔

خوب کی تصنیف تاریخِ جدید
جس کے لاکھوں مدح خواں' طالب کرور
نظم کر سالِ مسیحی' اے منیر
ہے یہ بہتر تحفۂ دریائے شور (۱۶۸)

میجر جان ہاٹن جو جزائر انڈمان کے کمشنر تھے منیر اور دوسرے اہل علم حضرات کے ادبی شغف کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ منیر چونکہ ان کے دفتر میں کام کرتے تھے لہٰذا وہ ان پر کچھ زیادہ ہی مہربان تھے۔ میجر جان ہاٹن ہی کے حکم سے مولوی مظہر کریم(۱۶۹) نے جو صاحب علم و فضل اور منیر کے دوست تھے جغرافیہ کی مشہور کتاب " مراصد الاطلاع " کا ترجمہ سلیس اور بامحاورہ اردو میں کیا۔ منیر نے قطعہ تاریخ نظم کیا' مولوی مظہر کریم کی لیاقت کا اعتراف منیر اس طرح کرتے ہیں۔

مترجم مولوی مظہر کریم اس کے ہوئے دل سے
فضیلت جن کی روشن تر مثالِ مہرِ انور ہے
اسیری اور غربت میں پھنسے ہیں وہ بھی بندہ بھی
گھڑی بھر کا بھی کٹ جانا یہاں مانندِ خنجر ہے (۱۷۰)

منیر کا خیال تھا کہ کالے پانی میں مقید ہونے کے سبب ان کا علم و فضل رائیگاں جا رہا ہے اور وہ فیض جو صاحبان علم و ادب تک پہنچنا چاہیے وہ اس سے محروم ہو گئے ہیں۔

پھنسا ہے اس طرح مجھ سا مفیدِ خلق محبس میں
کہ علمِ کیمیا جیسے دلِ قاروں میں زندانی (۱۷۱)

انڈمان میں منیر کا بیشتر وقت مولانا فضل حق خیر آبادی (۱۷۲) کی صحبت میں گزرتا تھا۔

مولوئ بے نظیر، فضلِ حق اسمِ شریف
دہلی سے تا لکھنؤ، مشتہر و موتمن
قید میں، میں اور وہ رہتے تھے ایک جگہ
عین سمندر میں تھے غرقۂ بحرِ محن (۱۷۳)

منیر کی کلیات میں ایک قصیدہ حضرت حسنؓ کی منقبت میں ہے جو انہوں نے مولانا خیر آبادی ہی کی فرمائش پر لکھا۔ اس قصیدہ کا مطلع اول ہے۔

اشکِ زلیخا ہوئے بحر صفت جوش زن
غرق ہوا نیل میں، یوسفِ گل پیرہن (۱۷۴)

مولانا فضل حق کا خیال تھا کہ اردو زبان میں مصطلحات عجم کو بیان کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ لیکن منیر کا خیال اس کے برعکس تھا، چنانچہ انہوں نے اس انداز کے ساتھ یہ قصیدہ لکھنا شروع کیا۔ جو کچھ روز کہتے وہ مولانا کو سنا دیتے۔ ابھی نصف قصیدہ ہی مکمل کر پائے تھے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی کا انتقال ہو گیا۔ اس قصیدہ میں اس سانحہ کی طرف اشارہ موجود ہے۔

نصف قصیدہ کیا سامنے ان کے رقم
ختم ہوا جب وہ تھے ہمدمِ گور و کفن (۱۷۵)

یہ قصیدہ لکھتے ہوئے منیر کو صرف اپنے حافظہ پر بھروسہ کرنا پڑا کیونکہ یہاں حوالے کے لئے کتابوں کا ملنا ناممکن تھا۔

قید میں قحطِ کتاب، حافظہ ازبس ضعیف
پر مددِ غیب سے خامہ ہوا حرف زن

ان ہی ایّام غربت میں منیر کو دو ایسے صدمات سے دو چار ہونا پڑا جس نے ان کو ہلا کر رکھ دیا۔ ۱۲۷۹ھ میں پہلے ان کی زوجہ اور پھر اسی سال کے آخر میں ان کی ہمشیرہ کا انتقال ہوا۔ منیر کے اعزاء نے ان کو خطوط کے ذریعہ اطلاع دی۔

زوجہ ام مرد ز آلامِ اسیری من انیک
خانہ ویران شد و برباد شد اسباب دریغا (۱۷۶)

اس دکھ بھری زندگی کے باوجود منیر نے انڈمان میں شعر گوئی ترک نہیں کی شاید ایسا کرنا ان کے بس میں بھی نہیں تھا کیونکہ اول تو شعر کہنا ان کی فطرت کا تقاضہ تھا، دوم ان کو اس شغل میں اپنے درد و غم کا اظہار کرکے یک گونہ سکون ملتا تھا۔ آمد شعر اور کثرت شعر گوئی کی طرف انہوں نے اپنے ایک خط میں اشارہ کیا ہے۔ یہ خط انہوں نے انڈمان سے اپنے ایک شاگرد محمد وزیر خاں مقیم شہر باندہ کے نام لکھا ہے فرماتے ہیں۔

" یہ عنایت ایزدی مشق سخن ہماں و بحر افادہ غیبی موج زناں است، بیشتر غزلیات و بعض قصائد لباس نظم پوشیدہ "(۱۷۷)

اس صورت حال کے ساتھ ساتھ منیر کو اس امر کا بھی احساس تھا کہ ان کی خداداد صلاحیتوں کا اظہار قیدوبند کی زندگی کی بدولت اس طرح نہیں ہوپاتا جس طرح کہ عام حالات میں ہوا کرتا تھا۔

نیم جاں مدت سے ہے مُخفی کمال اپنا منیر
تھا جو پورا قید میں رہ کر ادھورا ہو گیا (۱۷۸)

اپنی ایک تحریر میں جو انہوں نے رجب ۱۲۷۸ھ (جنوری ۱۸۶۲ء) میں مدراس کے کچھ سخن ور حضرات کے نام ان کی فرمائش کے جواب میں روانہ کی حالات اسیری کا اثرا اپنی شاعری پر اس طرح بیان کیا ہے، لکھتے ہیں۔

اما از بدو زمان اسیری کہ سہ سال کسری کم وبیش برآں رفتہ و از زندان کربت بہ تیہہ غربت افتادہ ام حلاوت سخن را آب شور بردہ۔ (۱۷۹)

اگست ۱۸۶۲ء میں منیر نے ایک غزل کہی۔ وہ اپنی اس فکر سخن سے مطمئن نہیں جس کا اظہار انہوں نے غزل کے مقطع میں کیا ہے، جس سے اس غزل کے سال تصنیف اور مہینے کا بھی تعین ہو جاتا ہے۔

زنداں میں اس کی سالِ مسیحی کہو، منیر
مالِ ردی ہے نظم یہ ماہِ اگست کی (۱۸۰)

منیر نے انڈمان میں جو کچھ کہا اس کا ایک جائزہ ہم نے منیر کی حبسیہ شاعری کے تحت لیا ہے اس لئے انڈمان میں ان کی ادبی زندگی کے اس گوشہ کو یہاں قلم انداز کیا جاتا ہے۔

اپنی نیک چلنی، خوش وضعی اور اچھے طور طریق کی بدولت منیر کی سزا کے دو برس معاف ہوئے۔

انعام میں معاف ہوئے ہم کو دو برس
شکرِ خدا رہا ہوئے کامِ نہنگ سے (۱۸۱)

چنانچہ ۱۳ صفر ۱۲۸۲ھ مطابق ۸ جولائی ۱۸۶۵ بروز شنبہ جب منیر کو رہائی کا پروانہ ملا تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور جہاز کے ذریعہ اس جزیرے سے کلکتہ روانہ ہو گئے۔

آج میں نے قید سے پائی رہائی، اے منیر
فضلِ حق سے یہ خوشی کی دوپہر مسعود ہو
اس جزیرے سے سوئے کلکتہ ہوتا ہوں رواں
اے خدا، ہندوستان کا اب سفر مسعود ہو
آکے بیٹھا ہوں جہازِ تیز رو پر، شکر ہے
لنگر اٹھا ساعتِ فتح و ظفر مسعود ہو
مادّہ منظور ہے کہنا دعائیہ مجھے
نیک ساعت ہو، کواکب کی نظر مسعود ہو

آج کے دن کی ہے یہ تاریخ صوری معنوی
روز شنبہ نیمۂ ماہِ صفر مسعود ہو (۱۸۲)

بعض تذکرہ نگاروں نے انڈمان سے منیر کی رہائی کو نواب یوسف علی خاں ناظم کی کوشش کا نتیجہ قرار دیا ہے اور اس کی بنیاد ناظم کے اس شعر پر رکھی ہے

ناظم منیر آئے یہاں ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ منیر کو رہائی قیدوبند کی مدت کی تکمیل کے بعد مقررہ تاریخ پر ہوئی۔ اسی طرح رام بابو سکسینہ اور ابواللیث صدیقی نے ان کی رہائی کی تاریخ مختلف بتائی ہے جو شواہد کی روشنی میں درست نہیں(۱۸۳)

رہائی کے بعد الٰہ آباد، لکھنؤ اور آگرہ میں قیام
۱۸۶۵ء — ۱۸۷۰ء

منیر کا انڈمان سے کلکتہ کا سفر بڑا خوش آئند تھا۔ ایک طرف تو رہائی کی خوشی اور دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کا اشتیاق اور دوسری طرف رام پور میں اپنی قدردانی کا یقین لیکن جب انہیں یہاں پہنچ کر اپنے مربی نواب یوسف علی خاں ناظم کے انتقال کا علم ہوا تو وہ بڑے دل شکستہ ہو گئے۔ چنانچہ کلکتہ سے الہ آباد آئے جہاں ان کے شاگرد علی عباد نیساں اور محب خاص میر غلام عباس موجود تھے۔ غلام عباس باندہ کے رؤسا میں تھے مگر اب الہ آباد ہی میں رہتے تھے۔ منشی منیر اور ان کی رسم و راہ ان بھلے دنوں کی تھی جب منیر کو آرام' دولت اور عزت سب ہی کچھ حاصل تھا۔ الہ آباد میں منشی غلام عباس نے منیر کی سرپرستی کی اور ان کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا لیکن ابھی منیر کی تقدیر میں کچھ اور تکالیف لکھی ہوئی تھیں۔ لہٰذا متعدد امراض شدید نے ان کو گھر لیا۔ بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ یوں بھی انڈمان کی شدائد سے بھرپور زندگی نے ان کی قوت مدافعت کم کر دی تھی۔ چنانچہ ایسی حالت میں معمولی بیماری بھی صبر آزما محسوس ہوتی ہوگی۔ وہ کن شدید امراض میں مبتلا ہوئے اس کی تفصیل کا علم نہیں ہوتا۔ البتہ اتنا ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان ناگہانی شدید بیماریوں نے ان کو زندگی سے مایوس ضرور کر دیا تھا۔ بالآخر حکیم خلیل الدین کے علاج

سے شفایاب ہوئے۔ اس بیماری کی مدت کے دوران ان کے شاگرد رشید علی عباد نیساں نے ان کی بہت زیادہ دیکھ بھال اور خدمت کی۔(۱۸۴)

اسی سال یعنی ۱۲۸۲ھ میں منیر کو اپنے باکمال شاگرد لالہ دیبی پرشاد تسلیم کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا،جو فرخ آباد کے رہنے والے تھے۔ الہ آباد میں منیر کا دل نہیں لگا لہٰذا احمد حسن خاں عروج سے ملاقات کا شوق ان کو کان پور لے گیا۔

کان پور جاکر احمد حسن خاں عروج سے ملنے کا خیال منیر کے دل میں اپنی رہائی کے ابتدائی لمحات ہی سے موجود تھا ورنہ وہ انڈمان سے کلکتہ آتے ہوئے سفر کے دوران جہاز پر عروج کی مدح میں قصیدہ نہ کہتے ۔ اس قصیدہ کو نظم کرتے ہوئے ان کو کسی قدر دشواری بھی پیش آئی کیونکہ ان کی آسماں گیر فکر رسا انڈمان کی مجہول زندگی گزارنے کے بعد اب اس مرغ پر بستہ کی مانند ہو چکی تھی جس نے ایک مدت سے اپنے پر پرواز کو کسی لمبی اڑان کے لئے آزمایا نہ ہو۔

کان پور میں منیر زیادہ دن نہیں ٹھہرے اور وہاں سے لکھنؤ کی طرف نکل گئے جہاں ان کے استاد مرزا دبیر موجود تھے۔ یہ واقعہ محرم ۱۲۸۳ھ کا ہے۔ منیر نے یہاں اپنے دوستوں اور استاد مرزا دبیر سے ملاقاتیں کیں بلکہ ان کے ہمراہ ایک بڑی یادگار مجلس میں شریک ہوئے جو داروغہ میر واجد علی تسخیر(خیر خواہ کمپنی) (۱۸۵) کے امام باڑہ واقع گولا گنج میں ہوئی تھی۔ اسی مجلس میں مرزا دبیر نے اپنا نو تصنیف مرثیہ۔

پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی

پیش کیا۔

وحشت آباد لکھنؤ سے منیر کا جی کچھ اس طرح اچاٹ ہوا کہ دوبارہ کان پور آگئے۔ یہ وہ لکھنؤ نہ تھا جس کا دور شباب منیر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد عروس البلاد لکھنؤ پر جو دس برس گزرے انہوں نے یہاں کی سماجی اور ادبی زندگی کا نقشہ ہی بدل کے رکھ دیا تھا۔ وہ شعروادب کی محفلیں جہاں پہلے شعروسخن کو نقد جاں سے بھی عزیز تر اور زر کامل عیار سمجھا جاتا تھا اب بے قدروقیمت اور متاع کاسد قرار پا چکے تھے۔ وہ دربار پرورش لوح وقلم ہی کا وسیلہ نہ تھے بلکہ ان کا ہونا صاحبان علم وفضل کو وہ قوت لایموت بھی فراہم کرتا تھا جو تخلیق فن

کے لئے ضروری شرط ہے۔ وہی افراد آج خود دل ریش تھے جو پہلے کبھی دوسروں کے زخموں کے لئے مرہم بنے ہوئے تھے۔

اردو زبان بھی کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔ وہ محاورے اور روزمرہ جو سخن کا معیار تھے اب نااہلوں تک پہنچ کر اپنی قدر کھو چکے تھے۔ منیر جو ایک مدت کے بعد لکھنؤ آئے تھے اس صورت حال اور انقلاب سے بہت دل برداشتہ ہوئے۔ شعروسخن کی محفلوں میں ان کا جی نہیں لگتا تھا مگر شعرگوئی چونکہ ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی اس لئے اپنی طبیعت کے تقاضے سے مجبور تھے اور شعر کہتے تھے۔

پرانے مربّیوں کا مٹ جانا اور ان کی جگہ مسند دولت پر ایسے لوگوں کا آبیٹھنا جن کے دلوں میں شعروسخن کی کوئی قدر نہ تھی اس عہد کے شاعروں کے لئے ایک بڑا المناک واقعہ تھا۔ منیر جب ان دنوں شعر کہتے تو بیدلی کے پیدا کردہ حالات چپکے سے ان کی غزلوں میں در آتے تھے جن میں وہ عہد گزشتہ اور پرانے دوستوں کی صحبتوں کے ماتم گسار دکھائی دیتے ہیں۔

لکھنؤ سے کان پور آنے کے بعد منیر نے کچھ دن احمد حسن خاں عروج کے پاس آرام کیا۔ فرخ آباد جانے کا خیال دل میں آیا مگر کسی وجہ سے وہاں نہ جا سکے اور فرخ آباد جا کر اعزاء اور دوستوں سے ملنے کی آرزو دل میں لئے دوبارہ الہ آباد آگئے۔ اپنی اس ایک برس کی آوارہ خرامی کا ذکر انہوں نے اپنے بعض خطوط میں کیا ہے۔(۱۸۶)

اس دوران میں منیر نے جہاں اپنے پرانے مربّیوں سے قدیم روابط بحال کرنے کی کوشش جاری رکھی، وہیں نئے رؤسا اور نوابین کی سرپرستی حاصل کرنے کی سعی بھی کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں ان کو چند درچند مشکلات بھی پیش آئی ہوں گی جس کا سب سے بڑا سبب ایک طویل مدت تک ان کا برِصغیر کے ادبی منظر سے غائب رہنا تھا۔ تاہم ہمیں ایک دونام ایسے ضرور مل جاتے ہیں جنھوں نے اس تہی دستی کے زمانہ میں کسی حد تک منیر کی دست گیری کی، ان میں سید ناصر علی ذوالقدر اور محمد تقی خاں صولت کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ سید ناصر علی ذوالقدر لفٹنٹ گورنر کے میر منشی تھے اور خاں بہادر کا خطاب حکومت انگلشیہ سے ان کو حاصل تھا۔ شاعر بھی تھے اور زریں تخلص کرتے تھے۔ ناصر علی ایک صاحب علم شخص تھے اور شاعروں کا بالخصوص منیر کا بہت خیال رکھتے تھے۔

منیر کے قدیم قدردانوں میں نواب علی بہادر ابھی حیات تھے جو اندور کے قلعہ میں نظر بندی کے دن گزار رہے تھے۔ منیر نے انڈمان سے واپسی پر ان سے بھی بذریعہ مراسلت تجدید مراسم کی کوشش کی۔ نواب علی بہادر اب انگریز کے وظیفہ خوار تھے اور منیر کے ساتھ' اس داد و دہش کی قدرت نہیں رکھتے تھے جو وہ ۱۸۵۷ء سے قبل بحیثیت ایک والئی ریاست کے ان کو حاصل تھی۔ پھر بھی گاہے گاہے وہ منیر کو بعض تحائف سے نوازتے رہتے تھے۔

منیر کو اس زمانہ میں اگر کہیں قدردانی اور ملازمت کی توقع ہوسکتی تھی تو وہ دربار رام پور ہی ہوسکتا تھا۔ وہ رام پور کے نواب کے لئے اجنبی نہ تھے مگر اس کے باوجود ان کی دلی تمنا کی تکمیل فوری طور پر نہ ہوسکی۔

الہ آباد یا کان پور سے ان ایّام میں انہوں نے جو خطوط بعض دوستوں کو لکھے ہیں' ان سے بھی ان کی تہی دستی اور مالی مشکلات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان خطوط میں بہت بیدلی اور شکستگی موجود ہے۔ سید ولی حیدر فرخ آبادی کے نام ایک خط میں جو انہوں نے ۲۴ رجب ۱۲۸۶ھ کو لکھا فرخ آباد پہنچنے کی شدید آرزو کا اظہار کیاگیا ہے۔ فرخ آباد میں جہاں منیر کے دوست اور عزیز شاگرد موجود تھے اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے چھوٹے بھائی سید حسین مطیر بھی وہیں دفن تھے مگر مفلسی اور تہی دستی کے سبب یہ سفر اختیار کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ (۱۸۷) بالآخر انہوں نے اس حالت محرومی کو اپنی تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا اور راضی بہ رضا رہنے لگے۔

الہ آباد میں منشی خواجہ غلام غوث بیخبر اور خان بہادر سید ناصر علی خاں (م ۱۲۸۳ھ) کے یہاں علمی اجتماعات ہوتے تھے جن میں منیر کے علاوہ خان بہادر مفتی اسد اللہ خاں سابق قاضی القضاۃ آگرہ اور مولوی وجیہ الدین الہ آبادی دائرہ شاہ اجمل سے آکر شریک صحبت ہوتے۔ ان محفلوں میں آنے جانے سے منیر کے مراسم خواجہ غلام غوث بیخبر سے استوار ہوئے جو اپنی شخصیت' وضعداری اور علم وفضل کے اعتبار سے الہ آباد میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔

۱۲۸۴ھ میں منیر ایک اور صدمے سے دو چار ہوئے۔ منیر کے استاد گرامی جناب علی اوسط رشک نے کربلائے معلّٰی میں انتقال کیا اور حضرت امام حسین ہی کے روضے میں دفن ہوئے۔ رشک اپنے پوتے کے انتقال کے دو برس بعد ۱۲۶۷ھ میں وہاں چلے گئے تھے۔ منیر کو اپنے

استاد رشک سے انتہا درجے کی محبت اور عقیدت تھی۔ رشک کی نظر زبان و لغت پر بہت گہری تھی۔ اس سلسلہ میں ان کو ناسخ کا صحیح جانشین قرار دیا جا سکتا ہے۔

اگلے برس یعنی ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں انہوں نے اپنی معرکتہ الآرا مثنوی "معراج المضامین" لکھنا شروع کی اور سات ماہ کی مدت میں اس کو مکمل کر لیا۔ یہ مثنوی جو کئی ہزار اشعار پر مشتمل ہے اتنے کم عرصہ میں وہ صرف اس لئے لکھ سکے کہ ان دنوں منیر کو نسبتاً زیادہ فراغت حاصل تھی۔

شعبان ۱۲۸۷ھ میں نواب کلب علی خاں' والئی رام پور کے فرزند کی شادی کا علم منیر کو ہوا تو انہوں نے متعدد قطعات تاریخ بہ سلسلہ تہنیت کہہ کر ایک منظوم عریضہ محررہ ۹ شعبان کے ساتھ رام پور روانہ کئے۔(۱۸۸) منیر کی دلی تمنا تھی کہ کوئی صورت ریاست رام پور میں ملازمت کی نکل آئے تاکہ ان کی تنگ دستی دور ہو سکے۔یہ درخواست بار آور ثابت ہوئی اور نواب کلب علی خاں نے منظوم عریضہ کے لکھے جانے کے پندرہ دن بعد یعنی ۲۴ شعبان کو ایک خط منیر کو بلانے کے لئے لکھا' ساتھ سو روپے کی ہنڈوی بطور زاد راہ الہ آباد روانہ کی۔

منیر رمضان المبارک ۱۲۸۷ھ مطابق نومبر ۱۸۷۰ء رام پور پہنچے۔ان کی زندگی کے آخری ایام رام پور ہی میں بسر ہوئے۔

O

قیامِ رام پور
(۱۸۷۰ء - ۱۸۸۰ء)

نواب کلب علی خاں' والئی رام پور انصاف پسند طبیعت کے مالک تھے۔ کوئی شخص بھی کسی پر

ظلم و ستم نہیں کر سکتا تھا۔ امن وامان کا یہ حال تھا کہ چوری اور ڈاکے یکسر ختم ہو گئے تھے، کمزور سے کمزور آدمی بڑی سے بڑی قیمتی چیز ہاتھوں میں لے کر بازار سے گزرتا تو کوئی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ نہیں سکتا تھا۔ حسن انتظام ایسا تھا کہ جواہرات اور سونے چاندی کے انبار دکانوں میں لگے ہوتے اور دن رات دکانیں یونہی کھلی رہتیں لیکن کسی کی کیا مجال کہ چوری کی نیت سے کوئی نظر بھر کر دیکھ سکے۔ قدم قدم پر چوکیدار تعینات رہتے جن کی نگرانی کے لئے لمحہ لمحہ افسران فوج اور پولیس گشت کرتی رہتی اور ہر دکاندار کھلی دکان میں پاؤں پھیلا کر سوتا۔ اسی موقع پر منیر شکوہ آبادی نے کہا ہے۔

رام پور آج کیوں نہ ہو آباد
اس کے طالع نے پائی بیداری
کوئی آنکھیں چرا نہیں سکتا
چور بھولے ہیں اپنی عیّاری (۱۸۹)

شعروادب کی ترقی کے لئے جس سرپرستی اور امن چین کی ضرورت ہے وہ ان دنوں رام پور میں عام تھا۔ تمام ہندوستان کے قابل لوگ کھنچ کھنچ کر وہاں پہنچ رہے تھے۔ اس اعتبار سے نواب کلب علی خاں کے دور حکومت کو بجا طور پر "عہدِ زرّیں" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ نواب کلب علی خاں اکیس برس کی عمر میں، مسند نشین سلطنت ہوئے تھے، تقریباً" ۲۳ برس تک انہوں نے حکومت کی اور ۲۷ جمادی الآخر ۱۳۰۴ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۸۷۷ء کو وفات پائی۔ (۱۹۰)

منیر نے جب رام پور میں قدم رکھا تو اس نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں انہیں کوئی خاص کوشش نہیں کرنا پڑی۔ وہاں کی زندگی اور وہاں کا کاروبار ان رؤسا اور امراء کے دربار سے کچھ مختلف نہ تھا جہاں وہ عمر کا بڑا حصہ گزار چکے تھے۔ البتہ شعروادب کا معاملہ کسی قدر جدا گانہ رنگ و آہنگ کا حامل تھا۔ اس تبدیلی کے کچھ تاریخی اور معاشرتی اسباب بھی تھے۔ شعروادب کی ایک روایت یہاں قدیم زمانے سے موجود تھی جس کا نقطۂ عروج ہمیں نواب کلب علی خاں کے عہد میں نظر آتا ہے۔ تاریخ ادب اردو میں رام پور کی ادبی خدمات کا ذکر عموماً" اس انداز سے کیا جاتا ہے جیسے وہاں شعروادب کی داغ بیل ۱۸۵۷ء کے بعد پڑی ہو۔ حالانکہ وہاں شعراء کا اجتماع ۱۷۷۴ء

(سال شہادت حافظ رحمت خاں) کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ (۱۹۱) بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر۔

"رام پور میں اردو شعراء کی محفلیں اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں جمنا شروع ہو گئی تھیں اور انیسویں صدی کے نصف اول میں اس نے اردو شاعری کے ایک اچھے خاصے مرکز کی حیثیت حاصل کر لی تھی' لیکن یہاں کے ماحول شعروسخن کی انفرادیت پوری طرح ۱۸۵۷ء کے بعد ابھری جب رام پور شمالی ہند میں سب سے اہم ادبی مرکز بن گیا"۔ (۱۹۲)

نواب کلب علی خاں کے عہد (۱۸۶۵ء/۱۲۸۱ھ تا ۱۸۸۷ء/۱۳۰۴ھ) تک جو شاعر لکھنؤ سے یہاں پہنچے ان میں منیر کے علاوہ یہ شاعر قابل ذکر ہیں۔

میر محمد زکی بلگرامی' مرزا محسن علی' میریار علی جان' منشی احمد حسن خاں عروج 'منشی امیر اللہ تسلیم' خواجہ ارشد علی قلق لکھنوی'گوبند لال حیا' حسین علی خاں شاداں اور شیخ امداد علی بحر۔ باہر سے آئے ہوئے ان شعراء کے علاوہ نواب یوسف علی خاں ناظم اور نواب کلب علی خاں کے عہد میں جو معروف مقامی شاعر داد سخن دیتے رہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ حافظ اللہ داد طالب' حکیم احمد خاں فاخر' میر شرف الدین ششدر 'فصیح اللہ خاں مفتوں' امداد علی خاں امداد' سید نظام شاہ' سید احمد علی 'عباس علی خاں بیتاب 'حشمت علی خاں موجد' فتح یاب خاں' حکیم مظہر احسن خاں احسن' امیر اللہ خاں امیر' محمد مظفر خاں گرم' مولوی محمد حیات خاں حیات' کرامت علی خاں کرامت' مہدی علی خاں نحیف (۱۹۳)

رام پور کی خاک سے بڑے بڑے کاملین فن' شاعر' صوفی اور ہنرور پیدا ہوئے ہیں جیسے ایک بیج میں چھپے ہوئے امکانات کو بروئے کار لانے کے لئے مناسب آب وہوا اور دیکھ بھال کی ضرورت پڑتی ہے' کسی خطۂ خاک میں بسنے والوں کی صلاحیتیں اس وقت تک مکمل طور پر اجاگر نہیں ہو سکتیں جب تک ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی نہ ہو۔ ۱۸۵۷ء میں سروں سے گزرنے والی موج خوں اتری تو دہلی اور لکھنؤ کی ویرانی کا منظر سامنے تھا۔ یہاں کے ٹوٹے ہوئے ستاروں کو یوں تو دوسری کئی ریاستوں نے اپنی آنکھوں میں جگہ دی جن میں ٹونک' منگرول' بھوپال' الور کے نام لئے جا سکتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ شعراء وادباء کی جتنی کثیر تعداد کا اجتماع حیدر آباد اور رام پور میں ہوا وہ اور کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ علمی اور تہذیبی روایت جو دہلی اور لکھنؤ کے مراکز میں پروان

چڑھ رہی تھی اس کی ترویج ہمیں اب شمالی ہند کی اسی مسلمان ریاست میں ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے کیا اسباب تھے۔ اول تو فاصلہ کے اعتبار سے ریاست رام پور دہلی اور لکھنؤ کے تقریباً درمیان میں واقع تھی۔ دوم یہاں کے قریب قریب سب ہی فرماں روا خود اچھے شاعر تھے اس لئے شعروادب کی قدر دانی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ انہوں نے شعراء کی جگر کاوی کے بدلے ہمیشہ ان کو بیش بہا انعامات واکرام سے نوازا۔ سوم یہ کہ انہوں نے اپنے دربار سے وابستہ علماء، فضلاء، شعراء اور ادباء کو اپنا ملازم نہیں دوست سمجھا اس لئے وہ ان سے دوستانہ سلوک کرتے تھے۔

گزشتہ علمی وتہذیبی روایت کی پاسداری اس ریاست کے حکمرانوں کے لئے اس لئے بھی ممکن ہو سکی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اس ریاست کو بہرنوع انگریزوں کی سرپرستی حاصل رہی چنانچہ امن وسکون کی فضا میں یہ فرماں روا شعروادب کی ترقی میں یہاں کے سابق حکمرانوں کی نسبت زیادہ توجہ دے سکے۔

دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کے ایک مرکز پر جمع ہونے کے سبب یہاں ایک نئے طرز سخن کی بنیاد پڑی۔ دہلی کی داخلیت اور لکھنؤ کی خارجیت جب ایک خوشگوار امتزاج میں ڈھلیں تو دونوں دبستانوں کی انتہا پسندی نے ایک معتدل انداز اختیار کیا۔ اساتذۂ لکھنؤ و دہلی کے یک جا ہونے سے زبان، الفاظ ومحاورات اور طرزادا میں بھی ایک نکھار پیدا ہو گیا۔

قاعدہ ہے کہ ایک زوال آمادہ تمدن میں ایسی اصناف ادب زیادہ پھلتی پھولتی ہیں جن میں اس خاص معاشرہ کے رہنے والوں کو جذباتی آسودگی کے ساتھ ساتھ تلخ حقائق سے فرار کا ایک راستہ بھی مل سکے۔ اس اعتبار سے رام پور کا حال بھی جب منیر شکوہ آبادی یہاں وارد ہوئے برِصغیر کے دوسرے علاقوں سے کچھ مختلف نہ تھا۔ لہٰذا یہاں بھی نثر کی سنجیدہ اور مفید اصناف کی طرف کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ دور اول میں کچھ تصانیف مذہب، قواعدوعروض اور لغت کی ضرور ملتی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ قابل قدر داستانیں بھی رام پور میں لکھی گئیں۔ مگر نثر کی یہ تصانیف گوشۂ گم نامی ہی میں پڑی رہیں۔

رام پور کی داستان نگاری کا زمانہ انیسویں صدی کے ربع ثانی سے شروع ہو کر کم وبیش سو سال تک جاری رہا۔ اس دور میں جو داستانیں تصنیف و تالیف ہوئیں وہ بہ اعتبار کمیت لکھنؤ میں لکھی جانے والی داستانوں پر سبقت لے گئیں۔ دو ایک کو چھوڑ کر یہ تمام داستانیں چونکہ غیر

مطبوعہ ہیں اس لئے ان کو وہ مقبولیت نہ مل سکی جو لکھنؤ میں لکھی جانے والی داستانوں کے حصہ میں آئی۔

منیر، نومبر ۱۸۷۰ء (رمضان ۱۲۸۷ھ) بہ عہد نواب کلب علی خاں (۱۹۴) رام پور پہنچے اور تقریباً" دس برس یہاں بسر کرنے کے بعد اگست ۱۸۸۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

منیر نے اپنے قیام رام پور کے دوران متعدد قصیدے نواب کلب علی خاں کی مدح میں لکھے ہیں۔ ان ہی قصیدوں میں وہ قصیدہ بھی شامل ہے جو انہوں نے نواب موصوف کی فرمائش پر نظم کیا اور جس میں شہر رام پور کے کوائف، وہاں کے موسم، عمارات اور اکابرین فن کی تعریف کی ہے۔ ان اکابرین میں علماء، اطباء، شعراء، خوش نویس، ماہران موسیقی، مصور، نقاش، حفاظ وقراء ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ دوسرے فنون کے ماہر افراد مثلاً" پہلوان، شاطر، گنجفہ باز غرض ہر میدان کے کامل الفن لوگوں کا تذکرہ اس قصیدہ میں موجود ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روہیل کھنڈ کی اس چھوٹی سی ریاست میں وہاں کے نواب کی علم پروری کی بدولت کیسے کیسے باکمال لوگ وہاں یک جا ہو گئے تھے۔ (۱۹۵) شعراء کے باب میں منیر لکھتے ہیں۔

مجمعِ شاعرانِ نامی ہے
شاعری کی ہے گرم بازاری

بحر(۱۹۶) منشی اسیر(۱۹۷)اور امیر(۱۹۸)
ہمسرِ انوری و مختاری

طبعِ پاکِ عروج(۱۹۹) و داغ(۲۰۰) سے ہے
منفعل ابر کی گہر باری

ہے جلال(۲۰۱) و حیا(۲۰۲) و شاغل(۲۰۳) سے
محفلِ نظم جلوہ گر ساری

مثنوی میں صبا(۲۰۴) و خواجہ بشیر(۲۰۵)
رونقِ شاعری و نثاری

بدر(۲۰۶)، شاداں(۲۰۷)، غمیں(۲۰۸)، غنی(۲۰۹) ہر دم
رہتے ہیں مدح خوانِ سرکاری

فارسی گو نثار شیرازی(۲۱۰)
تر زبانی میں ابرِ آزاری

فنِ تاریخ میں رسا، منصور(۲۱۱)
جان صاحب(۲۱۲) کی ریختی پیاری

سب سے بڑھ کر منیر کو حاصل
بے کمالی و ہرزہ گفتاری

منیر کے اس قصیدے سے رام پور کی عیش ونشاط سے بھرپور زندگی کا بھی کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مچھی بھون اور وہاں کے پری جمالوں اور ارباب نشاط کا تذکرہ بھی نام بہ نام اس قصیدہ میں موجود ہے۔

سیر مچھی بھون کی چل کر دیکھ
کیا نمایاں ہے قدرتِ باری

ہنستی پھرتی ہیں باغ میں پریاں
نہر یا جوئے شیر ہے جاری

مہندیوں سے ہتھیلیاں گل نار
ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں پیاری

پہنے ہیں رنگ رنگ کے جوڑے
دستِ نازک میں پائینچے بھاری

جادی جھومن کی وہ پری تانیں
قطع ممی کے ٹپوں کی پیاری

چست و چالاک، شوخ امانی جان
گفتگو میں بلا کی عیّاری

خود نمائی، امام باندی کی
سادگی میں بھی اک طرحداری

دِلّی والی امیر جان نے بھی
پائی گانے میں سب کی سرداری

کھمبے چاندی کے، ریشمی جھولے
سازِ عشرت کی گرم بازاری

طبلے، سارنگیاں ہیں ہم آواز
گونجتا ہے سپہرِ زنگاری

گا چکی ہیں منیر کی غزلیں
اب ہے ساون ملار کی باری (۲۱۳)

ساز و آواز کی موسیقی کے سلسلہ میں امیر خاں، بہادر حسین خاں، باقر علی، رحیم اللہ، مودھو اور حیدر بخش کے نام لئے گئے ہیں جو اپنے فن میں یکتائے روز گار تھے۔

نواب کلب علی خاں کے عہد میں مشاہیرِ شعراء کے یک جا ہونے اور خود نواب موصوف کے شغف علمی کی بدولت رام پور میں شعروسخن کا بازار گرم تھا۔ نواب کلب علی خاں صبح سویرے ریاست کا کام کیا کرتے، سہ پہر کا وقت علمی مشاغل کے لئے وقف تھا۔ باریاب ہونے والے شعراء کے لئے ہدایت تھی کہ وہ روزانہ سہ پہر قلعۂ معلیٰ کی اس مخصوص عمارت میں یک جا ہو جائیں جو مصاحب منزل کہلاتی تھی اور نواب صاحب کے مقربین کے قیام کے لئے مخصوص تھی۔ یہاں شعروسخن کی محفلیں سجتیں، علمی مباحث ہوتے (۲۱۴) منیر بھی جو ناسخ اور سید علی اوسط رشک

کے تربیت یافتہ تھے، ان بحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ نواب صاحب مقررہ اوقات میں علماء، شعراء اور دوسرے ماہرین فن سے ملاقات کرتے۔ ہر جمعہ کے روز ان کے محل میں محفل مشاعرہ برپا ہوتی جن میں قرب جوار کے سب شاعر شریک ہوتے تھے۔ (۲۱۵)

نواب کلب علی خاں کو تحقیق لفظی کا خاص شوق تھا اور الفاظ کی صحت و عدم صحت کے مناظرے ان کے سامنے ہوا کرتے تھے جن میں منیر بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔(۲۱۶) شعروادب میں نواب کلب علی خاں کی ذاتی دلچسپی کی بدولت اس فن لطیف کو رام پور میں بڑی قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

مشاعروں کے علاوہ میلے بھی لگتے جن میں "جشن بے نظیر" بطور خاص قابل ذکر ہے۔ نواب کلب علی خاں ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء کو مسند نشین ریاست ہوئے تو سال جلوس کی یاد گار قائم کرنے کی غرض سے ایک سالانہ میلے کی تجویز کی۔ موسم بہار کے لحاظ سے یہ میلہ ہر سال مارچ کے آخری ہفتے میں ہوتا تھا۔ میلہ کا آغاز ۱۸۶۶ء سے ہوا اور نواب صاحب کی حیات یعنی ۱۸۸۷ء تک جاری رہا۔ ۱۸۷۲ء مطابق ۱۲۸۹ھ میں اس میلے کی مزید ترقی اس طرح ہوئی کہ نقش قدم مبارک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رکھنے کے لئے ایک نہایت شاندار عمارت تعمیر ہوئی جس پر میلے کے آخری دن پنکھا چڑھانے کی رسم بڑی دھوم دھام سے ادا ہوتی تھی(۲۱۷)۔منیر نے اس عمارت کی بنیاد رکھنے کی تاریخ کے بارے میں متعدد قطعات تاریخ اردو اور فارسی میں نظم کئے۔(۲۱۸)

"جشن بے نظیر" کے پانچویں دن ایک بڑا مشاعرہ برپا ہوتا تھا جس میں مقامی شعراء کے علاوہ باہر کے نامور شاعر بھی شریک ہوتے تھے۔

یوں تو رام پور ایک چھوٹی سی ریاست تھی، متعدد شعراء، علماء اور دوسرے اکابرین فن کی محض سرپرستی کا بوجھ کیسے برداشت کرتی۔ اس کا حل یہ تلاش کیا گیا کہ شاعر اور علماء صرف دربار سے وابستہ نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ مختلف محکموں میں خدمات سرانجام دیتے تھے۔ موقع بہ موقع نواب کلب علی خاں ان سے حسن سلوک بھی فرماتے رہتے تھے۔ منیر کو سو روپے مشاہرہ ملتا تھا۔ وہ وہاں کس شعبہ سے متعلق تھے اس بات کا علم کسی داخلی یا عصری شہادت سے تلاش و کوشش کے باوجود نہیں ہو سکا۔

نواب کلب علی خاں خود بھی فن شعر کے رموز اور باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس

لئے وہ اپنے دربار کے شاعروں سے کبھی کبھی شاعری کے سلسلہ میں فرمائش بھی کرتے تاکہ ان کی مہارت کو آزما سکیں۔ یہ فرمائشیں چونکہ مسابقت ومقابلہ کے انداز لئے ہوتیں اس لئے اس میں لطف کا پہلو بھی بہرحال موجود ہوتا۔ ایک بار انہوں نے حکم دیا کہ تمام شاعر پوری غزل بقید یک قافیہ "گریباں" کہیں۔ منیر شکوہ آبادی شاعری میں اپنے اساتذہ ناسخ و رشک کی کی وضع کردہ شرائط کے حد درجہ پابند تھے، ان کے استاد قافیہ "گریباں" جس میں "ن" کا اعلان نہیں ہے اضافت و عطف کے بغیر باندھنا درست نہیں سمجھتے تھے، اس لئے منیر کے لئے دوہری پابندیاں تھیں یعنی ایک تو قافیہ "گریباں" سے باہر نہ نکلیں دوسرے یہ قافیہ کسی بھی صورت میں بغیر عطف واضافت نہ آنے پائے۔ نواب صاحب کے حکم کو ٹالا بھی نہیں جا سکتا تھا چنانچہ انہوں نے غزل کہی اس غزل میں ۷۳ اشعار ہیں۔ لیکن اتنا کچھ کہنے کے باوجود منیر یہی سمجھتے تھے کہ اگر ان کے تخیل کے لئے یہ دوہری پابندیاں نہ ہوتیں تو ان کا رخشِ فکر کچھ اور بھی جولانیاں دکھاتا۔

خداوندِ نعم کے حکم سے چارہ نہ تھا ورنہ
نہ کہتا یہ غزل ہی ذکر کیا جیب و گریباں کا

منیر افسردہ ہوں پابندیٔ عطف و اضافت سے
نہیں تو لطف دکھلاتا مضامینِ گریباں کا (۲۱۹)

اسی طرح ایک اور موقع پر نواب کلب علی خاں نے ایک سنگلاخ زمین طبع آزمائی کے لئے تجویز کی یعنی قوافی حضور، سرور، نور وغیرہ اور ردیف "میں گردوں"۔ منیر نے بھی غزل کہی۔ اس غزل میں اکیس شعر ہیں۔ منیر جو غزل میں وسعت کے طلب گار رہتے تھے غزل کہتے ہوتے تنگنائے غزل سے قصیدے کے میدان وسیع وعریض کی طرف نکل گئے ہیں۔

میں اس کی بزم میں حاضر ہوں فضلِ خالق سے
نہ آئے رعب سے جس کے، حضور میں گردوں

جو چاہتا ہے کہ لے بوسۂ درِ دولت
نہ کھائے منہ کی کہیں اس غرور میں گردوں

محیطِ صورت و معنی ہے ہمّتِ نواب
خفا میں عرشِ معظم، ظہور میں گردوں
اگر تجلّیِ خورشید، نقشِ پا دیکھے
زمین بن کے رہے، رام پور میں گردوں

اور غزل کے مقطع میں اس غزل کی شان نزول اس طرح بیان کی ہے۔

منیر نے جو بہ حکمِ حضور گھیرا ہے
پھنسا ہے کوچۂ بین السطور میں گردوں (۲۲۰)

اسی طرح اور بھی متعدد غزلیں ہیں جو منیر کے اس دور آخر کی یاد گار ہیں اور ان کے دیوان سوم "نظم منیر" میں شامل ہیں۔ ایک اور سنگلاخ زمین، جس میں منیر نے نواب کی فرمائش پر طبع آزمائی کی، اس کے قوافی دفتر، خنجر اور محشر وغیرہ اور ردیف "کا جواب" ہے، منیر کہتے ہیں۔

طرح یہ نواب نے کی ہے میانِ رام پور
موجِ کوثر بھی نہیں اس مصرعِ تر کا جواب (۲۲۱)

نواب کلب علی خاں کی شعروسخن سے دل بستگی ان فرمائشوں سے پتہ چلتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ لفظ وبیان کے تمام امکانات کو بروئے کار لانے کے آرزومند رہتے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں نواب موصوف کی بے وقت موت ریاست میں اہل علم وفن کے لئے کسی طرح بھی مصیبت عظمیٰ سے کم نہ تھی۔ ان کی وفات کے بعد یہاں کے وابستگان دامن دولت نے مجبوراً دوسرے مقامات کا رخ کیا۔ نواب کلب علی خاں اگر اور زندہ رہتے تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ دبستانِ شاعری جس کی داغ بیل لکھنؤ اور دہلی کے باکمالوں کے ایک مرکز پر اکٹھے ہو جانے سے رام پور میں پڑ چکی تھی، اپنے منفرد خدوخال نمایاں تر کرتا۔

ربیع الاول ۱۲۹۲ھ میں منیر رام پور کے محلہ کٹرہ جلال الدین میں مقیم تھے جیسا کہ ان کے منظوم عرائض سے پتہ چلتا ہے جو انہوں نے مختلف امراء کو اپنی مثنوی معراج المضامین (سال تصنیف ۱۲۸۶ھ) کے سلسلہ میں تحریر کئے۔

وارد رام پور ہے مسکین
ساکن کٹرہ جلال الدین (۲۲۲)

منیر کی حیات مستعار کے آخری دس برس رام پور ہی میں بسر ہوئے۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ شروع شروع میں منیر کا دل رام پور میں نہیں لگا' وہ معاشی مجبوریوں کے تحت وہاں زندگی گزارنے پر مجبور تھے وہ وہاں رہتے ہوئے گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتے رہتے' ان کا دل ان دوستوں میں پڑا رہتا جو اب ان سے دور دوسرے شہروں میں بستے تھے۔ فرخ آباد اور الہ آباد کی ادبی محفلوں' مشاعروں اور ہنگاموں کا خیال آتے ہی وہ تڑپ اٹھتے تھے۔ الہ آباد میں دوسرے احباب کے علاوہ ان کے شاگرد رشید نیساں بھی رہتے تھے جن کی یاد اکثر ان کو ستاتی رہتی تھی۔

ہم بزم تھے یارانِ الہ آبادی
ہم شمع شبستانِ الہ آبادی
اب جمع ہیں رام پور میں گوہرِ اشک
اے فرقتِ نیسانِ الہ آبادی (۲۲۳)

مگر یہ صورت حال تا دیر قائم نہیں رہی۔ نواب کلب علی خاں بہت مہربان سخی اور دریا دل آدمی تھے۔ وہ منیر کے آرام کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ درباری شعراء میں بھی منیر کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ رفتہ رفتہ یہاں ان کا دل کچھ ایسا لگا کہ لکھنؤ اور یاران لکھنؤ کی یاد بھی دل سے جاتی رہی۔

کیا لکھنؤ سے کام جنابِ منیر کو
زنار بندِ زلفِ بتِ رام پور ہیں (۲۲۴)

منیر رام پور پہنچنے سے پہلے سرد و گرم زمانہ کا مزہ اچھی طرح چکھ چکے تھے' بالخصوص اس مدت نے جو انہوں نے انڈمان اور وہاں سے آنے کے بعد رام پور سے دور رہ کر گزاری' منیر کو بڑی حد تک شدائد برداشت کرنے کا عادی اور مزاجا" قناعت پسند بنا دیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ رام پور میں انہوں نے کسی قسم کی مالی مشکلات کو محسوس نہیں کیا اور اگر محسوس بھی کیا ہو تو اس کا اظہار ان کے کلام یا کسی تحریر سے نہیں ہوتا' لہٰذا یہ یقین کر لینے کو جی چاہتا ہے کہ منیر کی زندگی

کے آخری ایام نسبتاً زیادہ سکون اور آرام سے بسر ہوئے۔

منیر کی قدر و منزلت اپنے ہم عصر شعراء میں کیا تھی' اس امر کا اندازہ حضرت نجم آفندی کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی خودنوشت سوانح عمری کے اوراق میں ایک مشاعرہ کا حال لکھتے ہیں جس میں انہوں نے یادگار مومن و نسیم حضرت امیراللہ تسلیم کے ساتھ اپنے ایام جوانی میں شرکت کی تھی۔ وہ کہتے ہیں۔

"اللہ اللہ جب اس زمانے کا خیال آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سو برس سے جی رہا ہوں۔ مشاعرہ میں شاعر اور سامعین کی تعداد کافی تھی اور سب حضرت تسلیم کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں موصوف جن کی عمر اس وقت تخمیناً" ایک سو سال کی ہوگی' شاگردوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تشریف لائے۔ اس مشاعرہ میں اس دور کے اساتذہ کو مدعو کیا گیا تھا۔ کئی شعراء نے کلام سنایا۔ آخر میں حضرت تسلیم کی صدارتی غزل ان کے شاگرد نے سنائی کیونکہ بوجہ کبیر سنی حضرت تسلیم کے اعضا و زبان میں رعشہ تھا اور خود اپنا کلام نہیں سنا سکتے تھے۔ مشاعرہ کے اختتام پر شعراء اور سامعین بیٹھے رہے اور سب کی یہ خواہش تھی کہ حضرت تسلیم اپنی زبان سے کم از کم دو شعر سنائیں' لیکن کسی میں جرأت نہ تھی کہ حضرت تسلیم سے ایسی خواہش کر سکیں۔ حاضر مشاعرہ شعراء اور سامعین کی دلی خواہش کا جب مجھے اندازہ ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ آپ حضرات کو حضرت تسلیم کی زبان سے دو شعر میں سنوا دیتا ہوں۔ اس پر اکثر نے مسکرا دیا اور بعض ہنس پڑے اور بعض اساتذہ نے فرمایا "میاں تم بچے ہو بڑے بڑوں کا یہ حوصلہ نہیں چپکے بیٹھے رہو۔" میں کہاں چپ ہونے والا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر حضرت تسلیم سے ادباً" عرض کیا۔ "قبلہ اکثر شعراء اور سامعین آپ کی زبان مبارک سے صرف دو شعر سننا چاہتے ہیں اور میری بھی گزارش ہے۔" حضرت تسلیم میری اس درخواست اور دیدہ دلیری پر بہت حیران ہوئے۔ فرمایا۔ "میاں صاحب زادے تم کون ہو جو سب کی نیابت کر رہے ہو۔"

میں نے جواباً" عرض کیا۔ "میں نجم آفندی ہوں۔" ارشاد ہوا۔ "کون نجم آفندی' میں نہیں سمجھا" میں نے عرض کیا۔ "منیر شکوہ آبادی کا پوتا ہوں"[۲۲۵] یہ کہنا ہی تھا

کہ حضرت تسلیم تڑپ اٹھے، فرمایا۔ "ضرور سناؤں گا، ضرور سناؤں گا۔ منیر جیسے باکمال کے پوتے کی زبان خالی نہیں کی جا سکتی۔" یہ کہہ کر حضرت تسلیم نے کانپتی ہوئی آواز میں دو شعر پڑھے جنہیں حافظہ کمزور ہو جانے پر بھی میں آج تک نہیں بھول سکا۔

نہ ہوا کم کسی تدبیر سے چکر میرا
جب تھکے پائے جنوں، پھرنے لگا سر میرا

○

حجاب باغ میں نرگس کی چشم سے نہ کرو
یہ دیکھنے کی ہیں آنکھیں نظر نہیں آتا (۲۲۶)

جناب نجم آفندی نے اس واقعہ کے علاوہ بعض اور واقعات مثلاً" حضرت شوکت میرٹھی سے اپنی ملاقات کا تذکرہ جس انداز سے کیا ہے اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس عہد کے باکمال شعراء کے نزدیک منیر کا نام نہایت قدر و منزلت رکھتا تھا۔ (۲۲۷)

اپنے قیام رام پور کے دوران منیر شکوہ آبادی کو چند صدمات سے بھی دو چار ہونا پڑا جو دراصل لازمۂ حیات ہیں اور کوئی ذی روح ایسا نہیں جو حوادث زندگی کی اس دستبرد سے محفوظ ہو۔ ۱۲۹۰ھ میں منیر کے مربئ قدیم نواب علی بہادر والئی باندہ نے اندور کے قلعہ میں نظربندی کے عالم میں انتقال کیا۔ منیر نے فیاض زماں، امیر زیبا، کہہ کہ ان کی تاریخ وفات نکالی(۲۲۸)اس کے اگلے برس یعنی ۱۲۹۱ھ میں ان کے ایک اور قدیم مربی نواب معین الدولہ باقر علی خاں بہادر ظفر جنگ المتخلص بہ ساحر نے کان پور میں انتقال کیا۔ ساحر نظم و نثر دونوں میں ماہر تھے اور فارسی گوئی میں اہل زبان جیسی قدرت رکھتے تھے۔ اسی برس ان کے ایک اور مربی منشی غلام عباس نے وفات پائی۔ یہ وہی غلام عباس ہیں جن کی ملازمت میں کچھ ایام منیر نے انڈمان سے رہائی کے فوراً" بعد بسر کئے تھے۔ منیر جن کی طبیعت میں مروت وخلوص بہت زیادہ تھا ایسے قدردانوں کی جدائی سے حد درجہ ملول ہوئے جس کا اندازہ ان قطعات تاریخ ہائے وفات سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے ان مرنے والوں کی یاد میں لکھے ہیں۔ اسی برس ان کے شاگرد رشید نواب واجد علی خاں رضواں نے رحلت کی۔اسی سال رمضان کے مہینے میں ان کے ایک قریبی بھائی فوت ہوئے اور ان کے مرنے کے انیس دن بعد ان کے جواں سال فرزند عبدالحسین نے داعیٔ اجل کو لبیک کیا۔ یہ صدمہ منیر پر

بہت بھاری تھا۔اگلے برس ۱۲۹۲ھ میں منیر ایک اور صدمہ سے دو چار ہوئے۔ یہ غم ان کے استاد گرامی مرزا سلامت علی دبیر کی وفات کا تھا۔

سال ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں ملک گیر قحط پڑا۔ ایسا قحط جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں اس سے پہلے کہیں نظر نہیں آتی۔ قحط کے اگلے برس یعنی ۱۸۷۸ء میں بارشیں بہت ہی کم ہوئیں۔ ۱۸۷۹ء کا سال اور بھی خراب آیا جس سے حالات مزید ابتر ہو گئے۔ پہلے پہل خشک سالی اور پھر اتنی بارشیں ہوئیں کہ تازہ بوئی ہوئی فصلیں بہہ گئیں۔ بارشوں کے ساتھ ملیریا' ہیضہ اور چیچک نے موت کا بازار گرم کر دیا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۹ء کے درمیانی پانچ برس اس خطۂ ارضی کے باشندوں کے لئے گوناگوں آفات سماوی کا موجب تھے۔ یہ آفات اتنی پے در پے تھیں کہ برطانوی حکومت اپنے تمام تر وسائل کے باوجود خود کو ان مصائب کے مقابلہ میں بے دست و پا محسوس کرتی تھی۔اس دوران میں امدادی کاموں کے لئے جو رقوم حکومت نے خرچ کیں' اس سے بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۷۷ء کا قحط انتہائی شدید نوعیت کا تھا۔ ۱۸۷۲ء میں تمام ہندوستان میں جو رقم عام لوگوں کی بحالی پر حکومت نے خرچ کی وہ صرف سات سو تریسٹھ (۷۶۳) اسٹرلنگ پونڈ تھی جبکہ یہ رقم ۱۸۷۶ء میں اکیس لاکھ پینتالیس ہزار چار سو اکتیس پونڈ (۲۱۴۵۴۳۱) اور۱۸۷۷ء میں بڑھ کر ترپن لاکھ پینتالیس ہزار سات سو پچھتر (۵۳۴۵۷۷۵) پونڈ اسٹرلنگ تک پہنچ گئی تھی (۲۲۹)

ریاست رام پور جہاں منیر شکوہ آبادی زندگی کے آخری ایام بسر کر رہے تھے اس قحط سے شدید طور پر متاثر ہوئی۔ منیر نے جو سفر حیات کی شدتوں سے اس وقت تک خود بھی ٹوٹ پھوٹ چکے تھے ان جان لیوا حادثات سے گہرا اثر قبول کیا۔ انہوں نے قحط کے بارے میں ۴۷ رباعیاں کہیں' جن میں سے چند یہ ہیں۔

غلہ سے ہے ہر کشتِ تمنا خالی
ہاتھوں کی طرح پیٹ ہے سب کا خالی
سب بھوک کے مارے قحط میں مرتے ہیں
دوزخ نہ بھرا' ہو گئی دنیا خالی

جب قحط سے جاں بلب خدائی ہو جائے
کیوں رنگِ زمرد نہ طلائی ہو جائے
کپڑا بھی تو نام کو نہ ٹھہرے سرسبز
کاہی رنگواؤ' کہربائی ہو جائے

○

بادل کو ہے میری چشمِ پرنم کی تلاش
حجاج کو جیسے آبِ زم زم کی تلاش
پانی کا زمین سے جو خواہاں ہے فلک
خورشیدِ سحر کو بھی ہے شبنم کی تلاش

○

ہے دشمنِ جاں' نرخِ گرانِ گندم
سب ڈھونڈتے پھرتے ہیں نشانِ گندم
خورشیدِ فلک اگر خبر پا جائے
بدلے ابھی قرصِ زر سے نانِ گندم (۲۳۰)

منیر آفات سماوی کا سبب انسانوں کی معصیت اور سیہ کاری کو سمجھتے تھے۔

کھیتوں میں نہیں قحط سے دانے کی جگہ
ہے بھی تو ہوا کے خاک اڑانے کی جگہ
پھیلا ہے تمام ابرِ سیہ کاریٔ خلق
بادل کے نہ آنے کی ' نہ چھانے کی جگہ

○

مستغرقِ بحرِ معصیت ہیں ہم حیف
ڈرتے نہیں اس کے خوف سے اک دم حیف
اس قحط میں وحش و طیر بھی مرتے ہیں
اے شامتِ اعمالِ بنی آدم حیف (۲۳۱)

دس برس کی اس مدت میں جو منیر نے رام پور میں بسر کی وہ درباری شاعر کی حیثیت سے ہر موقع پر دادِ سخن دیتے رہے جس کا ثبوت وہ چودہ معرکتہ الآرا قصائد اور متعدد تاریخی قطعات ہیں

جو شامل کلیات ہیں۔ اپنی غزلوں میں بھی جہاں ان کو موقع ملتا ہے وہ قطعہ بند شعروں کی صورت میں نواب کلب علی خاں کی زندگی کے اہم واقعات کو بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً" نواب موصوف جب حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے' ان دنوں کہی ہوئی ایک غزل کا اختتام انہوں نے ان دعائیہ اشعار پر کیا ہے۔

حضور کو بخیر لائے حجِ کعبہ سے خدا
منیر کرتے ہیں دعا امیدوار ہر طرف
سواری آئے دھوم سے' خوشی ہو رام پور میں
فقیر لوٹتے پھریں زرِ نثار ہر طرف (۲۳۲)

اس دوران میں جن علمی وادبی سرگرمیوں میں منیر شریک رہے ان میں نمایاں واقعات مثنوی "معراج المضامین" کی اشاعت (۱۲۹۱ھ)۔ اور "کلیات منیر" کا چھاپا جانا ہے (۱۲۹۶ھ)۔ دربار رام پور سے وابستگی کے دوران میں انہوں نے ایک نثری داستان موسوم بہ طلسم گوہر بار بھی لکھی جس کا مخطوطہ رام پور رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔

وفات

منیر کی تاریخ وفات اور سبب انتقال میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔مگر تحقیق سے ثابت ہوا کہ منیر کا انتقال ۷ رمضان المبارک ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۳ اگست ۱۸۸۰ء کو جمعہ کے دن ہیضہ کے سبب ہوا (۲۳۳)

ان کے انتقال کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ ان کو زہر دیکر ہلاک کیا گیامگر پروفیسر علی سجاد مہر کا خیال ہے کہ منیر کی موت کسی وظیفہ یا عمل کے الٹ جانے کے سبب واقع ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"منیر کے انتقال کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہیضے میں مرے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کوئی عمل کیا تھا جو الٹا ہو گیا اور بالآخر ان کی موت کا سبب بنا۔" (۲۳۴)۔

لیکن ان دونوں آراء کی تصدیق کسی داخلی یا عصری شہادت سے نہیں ہوتی۔ البتہ ہیضہ کی وبائے عام کے بارے میں رام پور سٹیٹ گزیٹیر میں صراحت موجود ہے۔

"Cholera would seem to be endemic, for there is hardly a year in which this fatal disease does not make its appearance. Ordinarily it breaks out in the month of July and lasts till the end of September. For some reason or other the situation of the city appears to favour the development of the cholera bacillus" -(۲۳۵)

رام پور میں ہیضے کی مستقل سالانہ وبا اور اس کے دورانیے کی تفصیل سے اگست کے مہینے میں منیر کے انتقال کا سبب با آسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔منیر کے پوتے سید محمد محسن سے معلوم ہوا کہ ان کو سرائے دروازے کے برابر کوچۂ چماراں کے پاس لاڈلی جان کے مقبرہ میں دفن کیا گیا تھا۔ (۲۳۶)

حبسیہ شاعری

۱

سماج کی تشکیل انسان نے ایک پُر عافیت زندگی گزارنے کے لئے کی تا کہ وہ مل جل کر ان مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہو سکے جن کو وہ انفرادی طور پر حاصل کرنے سے قاصر تھا۔ سماج کے مستحکم قیام کے لئے ضروری تھا کہ اس معاشرہ میں آباد انسان اپنے کچھ انفرادی حقوق سے دست بردار ہو جائیں' یوں سماجی قوانین وجود میں آئے۔ ان اجتماعی قوانین کی پابندی سب پر لازم قرار پائی اور ان قوانین کو توڑنے کی سزا مقرر کی گئی۔ اس طرح زنداں اور قید خانے بنائے گئے۔ یوں تو ریاست سماج ہی کی ترقی یافتہ اور زیادہ طاقت ور صورت ہے لیکن ضروری نہیں کہ سماج میں بسنے والے افراد اور حکومت و ریاست کے درمیان ہمیشہ نظریاتی یکجہتی برقرار رہے۔ تصادم اور اختلاف کی صورتیں بھی پیدا ہوتی رہی ہیں' خصوصاً" ایسے حالات میں جب کسی علاقہ پر کسی غیر ملکی طاقت نے بہ جبر اپنا تسلط قائم کرنا چاہا تو آزادی کے متوالوں نے اپنی جان کی پروا کئے بغیر آزادی کے چراغ کی لو کو اپنے خون سے روشن رکھا۔ جابر حکمرانوں نے جب تاریخ کے دھارے کو پیچھے کی طرف دھکیلنا چاہا تو شاعروں اور ادیبوں نے جو معاشرے کا حسّاس ترین طبقہ ہوتا ہے' انسانیت کے جسم پر تازہ زخموں کو پوری شدّت سے محسوس کیا۔ انہیں اپنے ضمیر کی آواز بلند کرنے کی قیمت کبھی زندگی سے ہاتھ دھونے اور کبھی قیدوبند کی لرزہ براندام اذیتوں کی صورت میں ادا کرنا پڑی مگر یہ سودا بھی اس لحاظ سے مہنگا نہ تھا کہ قیدوبند کے شب و روز' زنداں کی آہنی سلاخوں اور قیدخانوں کی تاریک کوٹھڑیوں میں بھی ان کے سینوں کی تخلیقی حرارت کم نہیں ہوئی۔ دنیا کی بعض بہترین کتابیں قید خانوں میں ہی لکھی گئی ہیں۔

فارسی شعراء میں مسعود سعد سلمان اور خاقانی نے اسیری کی زندگی گزاری۔ ان کے زندانی اشعار میں بلا کا درد ہے۔ دور جدید میں اختلافات کی وجہ سے ملک الشعراء بہار، عشقی، ابوالقاسم لاہوتی، فرخی یزدی وغیرہ جیل میں رہے۔ یورپ کے قدیم وجدید اہل قلم جن کی زنداں میں لکھی ہوئی تحریروں کو شہرت حاصل ہوئی ان میں سکاٹ لینڈ کے شاہ جیمس اول، اطالوی شاعر ٹاسُر، جان بنین، سر والٹ سکاٹ، روس کے مشہور ناول نگار دوستووسکی، فرانسیسی شاعر، مفکر اور ڈرامہ نگار ژاں پال سارترے کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ برصغیر کی تاریخ ادب پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو قدیم وجدید دور میں متعدد نام باآسانی ایسے مل جائیں گے جن کے تخلیقی جوہر قیدوبند کے شدائد میں زیادہ نکھر کر سامنے آئے۔ مثلاً" حضرت مجدد الف ثانی، مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی مظہر کریم دریا بادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی اسیر مالٹا اور مولانا مودودی۔ ان افراد میں منیر شکوہ آبادی ایک ممتاز شاعر ہیں۔

منیر کی حبسیہ شاعری کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ حبسیہ شاعری کی حدود ونوعیت کا تعین کر لیا جائے۔ جب ہم حبسیہ یا زندانی شاعری پر غور کرتے ہیں تو کئی سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔

۱۔ کیا حبسیہ شاعری، شاعری کی وہ قسم ہے جس میں شاعر صرف اپنی ذہنی گھٹن کا اظہار کرتا ہے۔

۲۔ کیا حبسیہ شاعری سے مراد وہ تمام کلام ہے جو قیدوبند کی حالت میں لکھا گیا ہو۔ اس کے لئے یہ لازمی نہیں کہ اس کلام میں قید کی حالت میں قلب وجاں پر گزرنے والی کیفیات کا بیان لازمی طور پر پایا جائے۔

۳۔ کیا حبسیہ شاعری صرف اس شاعری کو کہیں گے جس میں زنداں کی زندگی پر روشنی پڑتی ہو، چاہے وہ شاعری جیل میں لکھی گئی ہو یا جیل کے باہر۔

ان سوالات پر غور کرنے سے پہلے لفظ "حبس" پر کسی قدر تامّل ضروری ہے جس سے حبسیہ کا لفظ مشتق ہے۔ حبس کا کا مطلب "گھٹن" یا انقباض' ہے(۱) جس کا متضاد "انشراح" ہے جس کے معنی کشادہ ہونے یا کھلنے کے ہیں۔ حبس یا گھٹن جسمانی بھی ہو سکتی ہے اور ذہنی بھی۔ شاعری میں جو گھٹن کی کیفیت انشراح یا کشادگی سے دو چار ہوتی ہے اس کی نوعیت جسمانی سے زیادہ نفسی

اور ذہنی ہے۔ ماہرین علم النفس نے نفس انسانی کی بھول بھلیاں کا سراغ لگانے کی بہت کوشش کی مگر انسانی نفسیات اس قدر پیچیدہ اور گرہ درگرہ ہے کہ دھاگے کا اصل سرا ہاتھ ہی نہیں آنے پاتا۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کی مادی زندگی اور اس کی آسائشوں کے نہ ہونے کے نتیجہ میں ذہنی کرب جنم لیتا ہے مگر اکثر صورتوں میں یہ ذہنی کرب ان محرکات سے بھی پیدا ہوتا ہے جن کا تعلق اس مادی دنیا سے نہیں ہوتا۔ نفس انسانی جب اپنی خواہشات کی تکمیل کے سلسلہ میں خود کو مجبور اور بے بس پاتا ہے تو کبھی کبھی اس کو پوری کائنات ہی ایک وسیع زنداں محسوس ہونے لگتی ہے۔

ان نیلگوں فضاؤں کا ساحل ہے کس طرف
ہم بے سفینہ قید یہاں کس خطا میں ہیں

حدیث مبارکہ "ان الدنیا سجن المومن وجنته الکافر" (بے شک دنیا مومن کے لئے قید اور کافر کے لئے جنت ہے) کے الفاظ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔(۲) یہ خیالات چونکہ فارسی اور اردو کی متصوفانہ شاعری میں بہت شدومد سے اظہار پاتے رہے ہیں اس لئے اس نظریہ کی بازگشت بہت آسانی سے شاعروں کے کلام میں سنی جا سکتی ہے۔ انسان کو مجبور محض سمجھنا یا یہ جاننا کہ اس کو کچھ اختیار بھی حاصل ہے، فلسفہ کا ایک مہتمم بالشان موضوع رہا ہے۔ اس بحث کو فلسفۂ جبر وقدر کا نام دیا گیا۔ صوفیا اور فلسفیوں نے اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر سے اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور اپنے نظریہ کی حمایت میں مناسب دلائل بھی دیئے ہیں۔ اس تمام بحث کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان خلقی طور پر اپنے اعمال وافعال میں مجبور ہے۔ وہ مفکرین جو انسان کو بااختیار بتاتے ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی حد تک اس کو مجبور ہی سمجھتے ہیں۔ گویا اس باب میں فلسفیوں کی اکثریت کا رجحان جبریت ہی کی طرف ہے۔ وہ انسان جس نے اپنی قوت بازو سے حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی سعی کی اور اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا، خاص حالات میں یہ احساس اس کے دل ودماغ پر ضرور مستولی ہوا کہ کوئی نادیدہ قوت ہے جو اس کو اس کے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دیتی۔ صوفیا نے تو اس احساس کو خداشناسی کے لئے بہ منزلہ زینہ قرار دیا ہے۔ حضرت علیؓ کا قول عرفت ربی لبفسخ العزائم" (ترجمہ: میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا) اسی احساس کا ترجمان

ہے۔

آرزوؤں کی شکست وریخت اور اس سلسلہ میں انسان کی بے بسی سے قطع نظر ذہنی کرب اپنی بے بضاعتی کے احساس سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ حیات وکائنات کے وسیع وعریض تناظر میں آدمی کا وجود ایک موہوم نقطہ سے زیادہ نہیں جو زماں ومکاں کی حدود میں اس طرح بند ہے کہ اس سے باہر قدم رکھنا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ سائنسی ترقی کے نتیجہ میں انسانی تصرفات کے باوجود انسان کے اس روحانی و ذہنی کرب میں کمی نہیں آئی ہے۔ وہ خود کو جب چار دیوار عناصر میں مقید پاتا ہے تو چیخ اٹھتا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

ذہنی حبس ہی کی ایک صورت شدید احساس تنہائی ہے جو ہر بڑے فنکار کے یہاں ایک قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ احساس تنہائی بڑھتا جا رہا ہے۔ شاعر جب اپنے گردوپیش کو اپنے آدرش کے مطابق نہیں پاتا تو خود کو اس انجمن میں تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ احساس جس کو روحانی جلاوطنی (NOSTALGIA) کہنا زیادہ مناسب ہو گا' قدیم وجدید تمام رومانی شعرا کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ ذاتی محرومیوں کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بے دلی بھی ایک احساس تنہائی کو راہ دیتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر اردو کے قدیم شعراء کے دواوین کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے یہاں قفس اور مرغ اسیر کی تراکیب محض روایتی اور پیش پا افتادہ علامات نظر نہیں آئیں گی بلکہ ان استعاروں کی مدد سے ان شعراء کی زندگی میں پیش آمدہ تلخ حقائق کا تجزیہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ کے ان ادوار میں جب آزادیٔ اظہار مسلوب ہو اور زبان وبیان پر پہرے بٹھا دیئے جائیں' انسان کے جذبات واحساسات کے سوتے کسی حالت میں بھی خشک نہیں ہوتے۔ وہ اپنے اظہار کے لئے مختلف راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ ان پیرایوں میں رموزوکنایات اس اعتبار سے بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعہ جو بات کہنی مقصود ہوتی ہے وہ سننے اور پڑھنے والوں تک پہنچ بھی جاتی ہے اور کسی طرح کی گرفت بھی نہیں ہوتی۔ ہماری تاریخ میں ایسے صبر آزما ادوار

بھی آئے اور شاعروں نے اپنے سیاسی وسماجی شعور کا ثبوت دیتے ہوئے وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتے تھے "صیاد" "قفس" اور "گل چیں" میں مغل امراء وسلاطین کی چیرہ دستیوں، نادر شاہ کی ہلاکت آفرینیوں اور انگریزوں کی شاطرانہ اور مکارانہ چالوں اور مظالم کا سراغ بہت آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

ذہنی حبس کی اس بحث کو ہم اپنی تفہیم کے لئے تین خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول قید وتنہائی کا نظریۂ جبر۔ دوم صوفیا کا نظریۂ فراق اور سوم قید وتنہائی کا رومانی نظریہ۔(۳)

قید و تنہائی کے نظریۂ جبر کا تعلق انسان کی مادی اور طبعی زندگی سے ہے۔ ہر انسان کے کچھ خواب ہوتے ہیں۔ یہ خواب قدم قدم پر زندگی کے تلخ اور سنگین حقائق سے ٹکرا کر چور چور ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی دنیا کو اپنے خوابوں کی جنت میں ڈھالنے کا آرزو مند رہتا ہے مگر اس کا طبعی ماحول اور وہ سماجی ڈھانچہ جس میں وہ زندگی گزارنے پر مجبور ہے جب ان خوابوں کی تعبیر کے حصول میں مزاحم ہوتا ہے اور وہ خود کو اس بے رحم اور ناقابل تسخیر و تبدل ماحول میں جینے پر مجبور پاتا ہے تو اس کے دل ودماغ میں ایک کرب جاگزیں ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت میں ساری دنیا اس کو ایک ایسا زنداں محسوس ہوتی ہے جس کی اونچی دیواروں کو ڈھانا اس کے بس میں نہیں۔

صوفیا کے خیال مین اگر یہ دنیا بقدر آرزو وسیع بھی ہو جائے اور انسان کے خوابوں کو تعبیر مل بھی جائے تب بھی وہ اس تنہائی اور قید کے احساس سے نجات نہیں پا سکتا۔ ان کے نزدیک روح انسانی، روح کل سے جدا ہو کر انسان کے جسم میں مقید ہے۔ انسان کی بے چینی اسی لئے ہے کہ یہ جزو کل میں شامل ہونے کے لئے تڑپتا رہتا ہے۔ ؏ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا (غالب) مگر خود اس کے بدن کا زنداں اس وصل میں بڑی رکاوٹ ہے۔ گویا صوفیا کے نزدیک تمام انسانی زندگی تنہائی اور قید ہی کی ایک صورت ہے۔

اٹھ جائے اگر جسم کا پردہ نظر آوے
اس پردے میں مستور ہیں اسرار بہت سے

(مصحفی)

ہجراں تو ہے پہ یہ نہیں معلوم کچھ ہمیں
ہم آپ سے جدا ہیں کہ ہم سے جدا ہے وہ

(میر حسن)

قیدوتنہائی کے رومانی نظریہ کا تعلق فلسفۂ جمالیات سے ہے۔ انسانی ذہن فہم و گرفت میں نہ آنے والی حسن وجمال کی ان گنت صورتوں کو دیکھنے کا آرزومند رہتا ہے۔ یہ احساس اس کو ایک ایسے پیچیدہ اور پُراسرار دکھ سے دو چار کرتا ہے جس کے اصل محرکات کا سراغ لگانا ناممکن سی بات ہے۔ انسان کے دائرۂ حواس سے باہر نادیدہ و نامحسوس حسن کو پالینے کی تمنا انسان کو ایک مستقل خلش اور چبھن سے دوچار رکھتی ہے۔ ماہرین نفسیات نے اس کیفیت کو (NOSTALGIA) کا نام دیا ہے۔

احساس تنہائی کے یہ محرکات جن کا اوپر ذکر کیا گیا اکثر نفس انسانی میں بیک وقت اس طرح کار فرما ہوتے ہیں کہ ان کا الگ الگ تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ احساس قیدوتنہائی کا محرک چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو اس میں کلام نہیں کہ یہ احساس خود انسان کے لئے انتہائی سوز آفریں اور درد سے بھرا ہوتا ہے۔ اگر ذہنی حبس کی ان ممکنہ صورتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو حبسیہ شاعری کا دائرہ اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ کم وبیش ساری شاعری ہی اس میں سما سکتی ہے۔ ذہنی حبس کا محرک چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو تخلیق شعر اس حبس ہی کے انشراح کی ایک صورت ہے۔ شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس کی شاعری اس حبسیہ شاعری کی تعریف پر پوری نہ اترتی ہو۔ یہاں حبسیہ شاعری سے مراد ایسی شاعری ہے جو جسمانی قید کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس شاعری میں تمام وکمال وہ کیفیات و واقعات ہی رونما ہوئے ہوں جن سے قیدوبند کی حالت میں شاعر دو چار ہوا ہو۔ تاہم اس شاعری سے جو قیدوبند کی حالت میں تخلیق کی گئی ہو ہم ان کیفیات کا اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں اور کسی خاص شاعر کی حبسیہ شاعری کا درجہ بھی متعین کر سکتے ہیں۔ ایام جلاوطنی میں لکھی جانے والی شاعری بھی حبسیہ شاعری ہی کے تحت آتی ہے کیونکہ جلاوطنی کی زندگی بھی ایک طرح سے قید ہی کی صورت ہے جس میں ذہنی کرب کسی طرح بھی زنداں کی چاردیواری میں بسر ہونے والے شب وروز سے کم نہیں ہوتا۔(۴) جرم کی نوعیت کو جس کے نتیجہ میں کسی شاعر نے قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کیں اس سلسلہ میں زیر بحث نہیں لانا چاہیے کیونکہ یہ میدان قانون اور اخلاقیات کا ہے، شاعری کا نہیں ہے۔

اردو کے وہ نامور شاعر جنہوں نے جلاوطنی کی زندگی گزاری یا جن کو زنداں کی سختیوں سے گزرنا پڑا ان میں اکثریت سیاسی قیدیوں ہی کی ہے۔ ان تمام شعراء میں صرف ایک نام مرزا اسد اللہ غالب کا ایسا آتا ہے جن کو غیر سیاسی اسباب کی بنا پر جیل جانا پڑا۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جدوجہد آزادی جس کو انگریز حکمرانوں نے بغاوت کا نام دیا' ایسی موج تند و بلاخیز تھی جو اپنے جلو میں مصائب اور ہلاکت کا سیلاب لے کر آئی۔ جس شخص کے بارے میں انگریزوں کو ذرا سا بھی شبہ ہوا کہ اس نے کسی نہ کسی طور مجاہدین کی مدد کی ہے یا ان کا ساتھ دیا ہے' اسے یا تو ہلاک کر دیا گیا یا پھر جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی سانحہ خود کو سنبھالنے کی محض ایک اضطراری کوشش نہ تھی بلکہ اس کی تہہ میں ایک شعور کارفرما تھا جس کا سلسلہ اس جدوجہد سے جا ملتا ہے جو تاریخ میں تحریک مجاہدین کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کا نقطۂ آغاز ۱۷۰۷ء کو قرار دیا جاتا ہے۔ مغل سلطنت کے انحطاط کے ساتھ مسلم معاشرہ جس بگاڑ کا شکار ہوا اس کو سہارا دینے کے لئے دو قوتیں میدان عمل میں آئیں۔ ایک طاقت ملکی حکمرانوں کی اور دوسری طاقت علمائے کرام کی تھی۔ عام لوگ بھی ان کے ساتھ تھے چنانچہ انہوں نے ان قوتوں کا ساتھ دیا اور جان ومال کی کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ان حکمرانوں میں سراج الدولہ' حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے نام سرفہرست ہیں۔ علماء کے حلقوں میں جو زندگی اور حرکت پیدا ہوئی وہ شاہ ولی اللہ کے افکار کا نتیجہ تھی جس نے بعد میں ایک سیاسی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ یہ تحریک اگرچہ بظاہر ۱۸۳۱ء میں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل کی وفات کے ساتھ ختم ہوگئی لیکن اس تحریک کے اثرات بہت بعد تک قائم رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں حصہ لینے والے بہت سے افراد سید احمد شہید کے افکار ونظریات سے متاثر تھے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جدوجہد کے بعد جب لوگوں کو انگریزوں کے غیض وغضب کا نشانہ بننا پڑا ان میں متعدد افراد صاحبان علم وفضل بھی تھے۔ ان میں وہ شاعر بھی شامل تھے جن کے تاثرات زندانی شاعری کی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں۔ یہی حبسیہ یا زندانی شاعری اس وقت موضوع زیر بحث ہے۔ اردو کی حبسیہ شاعری کی روایت کو تقویت دینے اور اس کو آگے بڑھانے میں جن شعرا نے

بھرپور حصہ لیا ان میں نواب واجد علی شاہ اختر، آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی کے نام بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

۳

۱۸۵۷ء سے پہلے اردو کے زندانی شعراء کے حالات اور کلام کا سراغ لگانا بہت مشکل کام ہے۔ اول تو ابتدا میں اس نوع کی شاعری کو کوئی منفرد حیثیت حاصل نہ تھی۔ دوم جن شعراء کا کچھ کلام ہم تک قدیم تذکروں کے توسط سے پہنچا ہے ان کا شاعرانہ مرتبہ بھی کچھ زیادہ بلند نہ تھا۔ علاوہ ازیں زندانی شاعری کے یہ نمونے اس قدر مختصر ہیں کہ ان کی روشنی میں بحیثیت حبسیہ نگار ان شعراء کے مرتبہ کا تعین کرنا ایک دشوار امر ہے۔

اردو کے زندانی شاعروں میں پہلا نام وزیر علی خان وزیری کا ہے جو آصف الدولہ کے جانشین تھے جن کو انگریزوں نے معزول کر کے بنارس بھیج دیا اور ان کی جگہ نواب سعادت علی خان کو مسند نشین اودھ کیا۔ وزیری انگریزوں کی زیادتی سے اس درجہ برگشتہ ہوئے کہ طیش میں آکر انگریز ریزیڈنٹ بنارس کو جس کا نام مسٹر چیری تھا قتل کر دیا(۵) قتل کرنے کے بعد وزیری فرار ہو گئے اور ایک مدت تک ادھر ادھر چھپتے پھرے۔ بالآخر مہاراجہ جے پور کی معرفت پکڑے گئے اور کلکتہ کے قریب قلعہ فورٹ ولیم میں نظربند کر دیئے گئے۔ وہیں بحالت قید جون ۱۸۱۶ء مطابق شعبان ۱۲۳۲ھ، چھتیس (۳۶) برس کی عمر میں انتقال کیا(۶)۔ نظربندی کے دوران کہی ہوئی ان کی ایک غزل صاحب تاریخ اودھ نے نقل کی ہے جو پیش کی جارہی ہے۔

جوں سبزہ رندے جاتے ہیں پیروں کے تلے ہم
اس گردشِ افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
روتے ہیں شب و روز اسی فکر سے یارب
غنچے کی طرح باغ میں گل ہو نہ کھلے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں
بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم

ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے

نرگس کے نہالوں میں تھے آصف کے پلے ہم

افسوس کہ اس دل کا کنول کھلنے نہ پایا

کوئی دن میں چلے جاتے ہیں ماٹی کے تلے ہم

اب پہلے ہی آغاز میں پامال ہوئے ہیں

فریاد کریں کس لئے قسمت کے جلے ہم

دکھ اپنا عبث کہتے ہیں بیدرد کے آگے

بے بس جو جہاں آگرے، ہرگز نہ ٹلے ہم

زندانِ مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں

رہتے ہیں وزیری ہی سے دن رات ملے ہم (۷)

سعادت خان ناصر نے اپنے تذکرہ میں وزیری کا ایک مطلع درج کیا ہے جو قیدِ فرنگ کے دوران لکھا گیا۔ مطلع یہ ہے۔

اٹھ گئے محفل سے سارے یار اور ہلچل پڑی

اے خلل انداز گردوں اب تو تجھ کو کل پڑی (۸)

وزیری کے ان شعروں میں ایک احساس شکست نمایاں ہے جو ان کی ذاتی زندگی کی ناکامی کا اثر ہے۔ لہجہ میں کہیں کہیں نسائیت موجود ہے(۹) جس نے بعض اشعار میں کوسنے اور دشنام کا سا انداز اختیار کر لیا ہے۔ وزیری کا اگر تمام وکمال حبسیہ کلام دستیاب ہو سکتا تو ان کی حبسیہ شاعری کے بارے میں کوئی بہتر رائے دی جا سکتی تھی۔

میر جہانگیر لکھنوی بھی ان قدیم اردو شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے قید میں انتقال کیا۔ میر جہانگیر کا اصل وطن دہلی تھا مگر چونکہ عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ میں بسر ہوا اس لئے لکھنوی کہلائے۔ آخر عمر میں وطن واپس آگئے تھے اور مرض مالیخولیا میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز کے وعظ میں میر شاہ علی کو جن کا تخلص درویش تھا کسی بات پر برہم ہو کر زخمی کر دیا جس کے نتیجے میں قید ہوئے۔ میر جہانگیر لکھنوی اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا حبسیہ کلام دستیاب نہیں

ہوا۔ صاحب خم خانہ جاوید نے ان کی ایک عام قسم کی غزل نقل کی ہے جو لطافت سخن سے عاری ہے اور ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔(۱۰)

بشیرالدین توفیق نے دکن میں ویلور کے قلعہ میں کچھ مدت اپنے والد سلطان شکراللہ اور دیگر اعزا کے ہمراہ نظر بندی میں گزاری۔ بشیر الدین توفیق سلطان ٹیپو شہید کے حقیقی پوتے تھے۔ جب ۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹم کے مقام پر سلطان موصوف افواج فرنگ کے مقابلہ میں داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے اور ان کا ملک سرکار کمپنی کے قبضہ میں آیا تو شہزادہ شکراللہ اور سلطان شہید کے دوسرے بیٹوں اور عزیزوں کو سرکارِ انگلشیہ نے قلعہ ویلور میں قید کر دیا۔ جب انگریز حکام نے ان افراد کا وہاں قیام خلاف مصلحت جانا تو کلکتہ میں منیالی گنج کو ان کی جائے سکونت قرار دیا۔ لٰہذا بشیر الدین توفیق بھی یہاں آ گئے اور یہیں ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء کے قریب ان کا انتقال ہوا۔ ان کا حبسیہ کلام دستیاب نہیں ہے(۱۱)

مرزا جہانگیر اکبر شاہ ثانی کے فرزند تھے جنھوں نے قیدوبند کی حالت میں بہ مقام الہ آباد انتقال کیا۔ مرزا جہانگیر طبعاً آوارہ مزاج اور خودسر تھے۔ اپنی حرکات ناشائستہ کے سبب پہلی بار الہ آباد میں انگریز حکام کے ہاتھوں نظر بند ہوئے مگر کچھ عرصہ بعد رہائی مل گئی۔ ان کی والدہ نواب ممتاز محل نے جو اکبر شاہ ثانی کی چہیتی بیگم تھیں ان کی قید کے دوران یہ منت مانی تھی کہ اگر میرا بیٹا رہا ہو گیا تو خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پر پھولوں کا چھپرکھٹ اور غلاف چڑھاؤں گی۔ یہ تقریب آج بھی پھول والوں کی سیر کے نام سے ایک میلہ کی صورت میں دہلی میں منائی جاتی ہے۔ قیدوبند کی اذیتوں سے مرزا جہانگیر نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا چنانچہ دوبارہ بدکرداری کے باعث نظربند ہو کر الہ آباد بھیجے گئے اور وہیں ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء میں انتقال ہوا۔ مرزا جہانگیر کی ایک غزل خم خانہ جاوید میں ملتی ہے جو اپنے زمانہ میں خاصی مشہور رہی مگر اس غزل کے بارے میں کوئی ایسی شہادت موجود نہیں جس کی بنا پر اس کو زندانی کلام قرار دیا جا سکے۔(۱۲)

۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں غالب پر اسیری کی ابتلا نازل ہوئی۔ کوتوال شہر کی دشمنی کے سبب ان پر قماربازی کا الزام لگا اور بہادر ظفر کی سفارش کے باوجود چھ ماہ قید کی سزا ہو گئی۔ اس اسیری کے دوران انہوں نے ۸۴ اشعار کا ایک ترکیب بند لکھا جو ان کی بہترین نظموں میں شمار ہوتا ہے۔ غالب کا یہ حبسیہ پہلی مرتبہ ان کے مجموعۂ کلام "سبدِ چیں" میں شائع ہوا(۱۳) یہ ترکیب بند چونکہ

فارسی میں ہے اور اس وقت ہمارے پیش نظر منیر شکوہ آبادی کی حبسیہ شاعری ہے جو تمام وکمال اردو میں ہے اس لئے غالب کی یہ نظم فی الوقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

۴

واجد علی شاہ اختر جدوجہد آزادی کے آغاز سے تقریباً" ایک سال پہلے الحاق سلطنت اودھ کے بعد (۱۴) مٹیا برج کلکتہ میں جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ جب مئی ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کا شعلہ بھڑکا تو انگریزوں نے باغیوں کے ساتھ ہمدردی کے شبہ میں ان کو مٹیا برج سے فورٹ ولیم کالج میں بحیثیت قیدی منتقل کر دیا(۱۵) اس نظربندی کے دوران ان کی والدہ' بھائی اور بھتیجی راحت آرا کا انتقال ہندوستان سے باہر ہوا۔ یہ صدمات ان کے لئے بہت غیر متوقع اور شدید تھے۔ زندانی شعرا میں واجد علی شاہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کا پورا کلام محفوظ ہے۔ نظربندی کے دوران ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ان کی مثنوی "حزن اختر" اور ان کے ان خطوط سے لگایا جا سکتا ہے جو مختلف بیگمات کے نام انہوں نے کلکتہ سے تحریر کئے ہیں۔ مثنوی "حزن اختر" ان ایام کی تصنیف ہے جب معزول شاہ اودھ قید فرنگ میں تھے(۱۶) یہ مثنوی ۱۲۷۶ھ مطابق ۶۰-۱۸۵۹ء میں پہلی بار مٹیا برج میں شائع ہوئی۔ عبدالرحمن احسن نے قطعہ تاریخ طبع کیا۔

حضرتِ سلطانِ عالم' دیں پناہ
اخترِ اوج و کمالِ برتری
حزنِ اختر مثنوی تصنیف کرد
واقعی خوش داد' دادِ شاعری
الغرض مطبوع شد احسن ز حکم
گفتمش تاریخ "حزنِ اختری"

اس مثنوی کے علاوہ ان کا کچھ اور حبسیہ کلام بھی ہے جو ان کے خطوط میں شامل ہے۔ فورٹ ولیم

کالج میں واجد علی شاہ کا قیام دو برس ۲ مہینے (ماہ شوال ۱۲۷۳ھ تا ذی قعد ۱۲۷۵ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء تا جولائی ۱۸۵۹ء) کے قریب رہا۔ واجد علی شاہ کی معزولی اگرچہ ۱۸۵۶ء کے اوائل میں ہوئی لیکن چونکہ ان کی مثنوی "حزن اختر" ان ایام میں لکھی گئی جب ۱۸۵۷ء کی شورش کے نتیجہ میں وہ نظربندی کی حالت میں بسر کر رہے تھے اس لئے اس کلام کو اس حبسیہ شاعری کا نقطۂ آغاز قرار دیا گیا ہے جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران یا اس کے نتیجے میں بعد کے دنوں میں وجود میں آئی۔

مثنوی چھوٹی تقطیع کے تیرہ سطور کے مسطر پر شائع ہوئی ہے۔ مثنوی کے کل صفحات ۱۱۲ ہیں اور شعروں کی کل تعداد ۱۲۳۸ ہے۔ اس مثنوی کی حیثیت ایک آپ بیتی کی ہے جس میں واجد علی شاہ نے اپنے معزول ہونے کے بعد کی تفصیل اور جزئیات کو پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس مثنوی کی مدد سے ہم ان ایام میں معزول شاہ اودھ کی ذہنی کیفیت کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے بھی یہ مثنوی ایک خاص دور میں پیش آمدہ واقعات کو سمجھنے میں بڑی مدد گار ثابت ہوتی ہے۔

مثنوی کا انداز اردو کی عام مثنویات سے الگ نہیں۔ اس کی ابتدا روایتی طور پر حمد، نعت اور منقبت سے ہوتی ہے جس کے بعد واجد علی شاہ نے قید خانے کے مصائب و آلام کا ذکر کیا ہے۔ پھر ایک مناسب تمہید کے بعد اپنا قصۂ غم اور حالِ پُرملال بیان کیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے حوالے سے جب بھی اردو کی حبسیہ شاعری کا جائزہ لیا جاتا ہے تو نگاہیں بہادر شاہ ظفر پر آکر ٹھہر جاتی ہیں۔ ان کا لہجہ اس قدر دردناک ہے کہ کوئی شخص بھی ان کے شعروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام جو رنگون میں جلاوطنی کے گزرے وہ بے بسی اور افلاس کی ایسی تصویر ہیں جن کے بیان کرنے کو پتھر کا کلیجہ چاہیے۔

جب جنگ آزادی کا غلغلہ بلند ہوا تو بہادر شاہ ظفر خود کو اس عوامی تحریک سے الگ نہ رکھ سکے اور بہت جلد عوام کے ایک محبوب رہنما بن گئے۔ اس تحریک کے ناکامی کے اسباب کیا تھے، یہ بحث موضوع سے باہر ہے۔ فتح دہلی کے بعد بہادر شاہ ظفر کو مقبرہ ہمایوں سے گرفتار کر لیا گیا۔ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو ان کے مقدمہ کا آغاز ہوا اور بالآخر ۹ مارچ ۱۸۵۸ء کو ان کو سزا سنا دی گئی۔ ۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو یہ شاہی قلعہ دہلی سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے(۱۷) اور اسی سال کے آخر میں

رنگون وارد ہوئے۔

آخر ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو اس آخری مغل فرماں روا کی تنہائی کی تمام اذیتوں، وطن کی جدائی کے غم، عزیزوں سے جیتے جی بچھڑ جانے کے دکھ، جوان بیٹوں کی شہادت کے داغ، ماضی کی تمام دل نشیں یادوں، حال کے کرب اور مستقبل کی سیاہی سب کا خاتمہ ہوگیا۔ ظفر رنگون ہی میں دفن ہیں اور ان کے پہلو میں ان کی وفا شعار بیگم زینت محل کی قبر ہے جنھوں نے حق رفاقت ادا کرنے میں کوئی کمی نہ کی۔

جلاوطنی کے دوران بہادر شاہ ظفر نے کیا کچھ کہا قطعی طور پر اس کا فیصلہ کرنا دشوار کام ہے۔ اگر صرف لہجہ کی دردمندی کو معیار قرار دیا جائے تو یہ خصوصیت تو ان کے رنگون جانے سے پہلے کے کلام میں بھی موجود ہے کیونکہ اس سانحہ سے پہلے بھی ان کو سکون کب تھا۔ ظفر کی تمام زندگی ہی ایک طرح سے روحانی جلاوطنی میں بسر ہوئی ہے۔ تاہم بعض اہل تحقیق نے ان کے جسیہ کلام کی نشان دہی کی کوشش کی ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی کے خیال میں درج غزلیں بہادر شاہ ظفر نے جلاوطنی کے ایام میں لکھیں۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے وہ میں ایک مشتِ غبار ہوں

○

مرغِ دل مت رو یہاں آنسو بہانا منع ہے
اس قفس کے قیدیوں کو آب و دانا منع ہے

○

لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

○

کبھی بن سنور کے جو آگئے تو بہارِ حسن دکھا گئے
مرے دل کو داغ لگا گئے وہ نیا شگوفہ کھلا گئے

○

جا کہیو ان سے نسیمِ سحر میرا چین گیا میری نیند گئی
تمہیں میری نہ مجھ کو تمہاری خبر' میرا چین گیا میری نیند گئی

○

نہ غنچہ ہے نہ سنبل ہے' پڑا ہے باغ ویرانہ
نہ گل ہے اور نہ بلبل ہے' نہ ساقی ہے نہ پیمانہ

○

خارِ حسرت قبر تک دل میں کھٹکتا جائے گا
مرغِ بسمل کی طرح لاشہ پھڑکتا جائے گا

○

میں ہوں نحیف و ناتواں' دور ہے یار کی گلی
اس کی ہوائے وصل پر مجھ کو اڑائے لے چلی

○

واہ کیا طرزِ ستم تجھ کو ستمگر یاد ہے
اک جہاں تیرے ستم سے کررہا فریاد ہے

○

بہکانے والے آپ کے سب یار بن گئے
سمجھانے والے مفت گنہگار بن گئے

○

تقدیر میری ان دنوں کیسی بدل گئی
ہاتھوں میں وہ پری مرے آکر نکل گئی

○

مجھ کو مت روکو مجھے یار کے گھر جانے دو
مثلِ پروانہ مجھے شمع پہ جل جانے دو

○

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا (۱۸)

مولانا امداد صابری نے اپنی تصنیف "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا" میں بہادر شاہ ظفر کے جبسیہ کلام کا جو انتخاب پیش کیا ہے اس میں مذکورہ بالا غزلوں کے علاوہ کچھ اور غزلوں کو ایام اسیری کی یادگار قرار دیا ہے۔ ان غزلوں کے مطلعے یہ ہیں۔

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بطور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے

○

نہیں حالِ دہلی سنانے کے قابل
یہ قصہ ہے رونے رلانے کے قابل

○

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں، میرا سینہ غم سے فگار ہے (۱۹)

آخری غزل کے تصنیف ظفر ہونے کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ "فغان دہلی" مرتبہ تفضل حسین کوکب دہلوی کے دوسرے ایڈیشن میں جو ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء کے بعد شائع ہوا، یہ غزل دہلی کے اُمّی شاعر حسامی کے نام سے منسوب کی گئی ہے(۲۰)۔ مرتب "نشیدِ حریت" کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ غزل ظفر کی تصنیف نہیں(۲۱) مگر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تحقیق کے مطابق یہ غزل ظفر ہی کی ہے اور اس سلسلہ میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں (۲۲) ڈاکٹر معین الدین عقیل بھی اس کو بہادر شاہ ظفر ہی کی غزل بتاتے ہیں(۲۳)۔ درج ذیل " ہولی " بھی ظفر کی یادگار بتائی جاتی ہے جو مولف "قومی ترانے اور نظمیں" کو ایک قوال سے ملی، ان کا بیان ہے کہ یہ بند نظر بندی کے دوران بہادر شاہ ظفر نے رنگون میں قید خانے کی دیوار پر لکھ دیئے تھے۔

ہند میں کیسی پھاگ مچوری' جورا جوری

پھول کا تختہ ہند بنا تھا' کیسر کی سی کیاری

ہند میں کیسی پھاگ مچوری' جورا جوری

کیسے پھوٹے بھاگ ہمارے' لٹ گئی باگ بہاری

گولن کے گلال بنایو' توپن کی پچکاری

آئے رہی سگری مکھ پر' ایسی تک تک ساری

شور دنیا میں مچوری

بہادر شاہ درگاہ جی مرد نے دین کا ساتھ دیوری

مرتے دم تک اس پریمی نے ' نام اس رب کا لیوری

ہند میں کیسی پھاگ مچوری' جورا جوری (۲۴)

خلیل الرحمن اعظمی نے اس "خیال" کو: کہو جی اب ہم کس کی باتن پر' لاویں گیان دھیان اور اس بھجن کو:

کون نگر میں آئے ہیں ہم' کون نگر کے باسے ہیں

جائیں گے اب کون نگر کو من میں ایسے ہراسے ہیں

رنگون میں ایام اسیری ہی کی یادگار قرار دیا ہے۔ اس کلام کے علاوہ بلاقی پرشاد نے اپنے تذکرے "تذکرۂ عالم" میں ایک مسدس کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں جو ان کے بیان کے مطابق بہادر شاہ ظفر نے دہلی سے رخصت ہوتے ہوئے کہے۔(۲۵)۔مسدس کے بعد اس کتاب میں ایک غزل بھی درج ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

کہاں خلقت عزیزو! زیرِ چرخِ پیر پھرتی ہے

یہ فانوسِ خیالی میں ہر اک تصویر پھرتی ہے

بہادر شاہ ظفر کا وہ مسدس جو "فغان دہلی" میں شامل ہے نظیر لدھیانوی کے خیال میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تصنیف ہے مگر ڈاکٹر طاہر فاروقی کی رائے ہے کہ اس طویل مسدس کے کم از کم دو بند بہادر شاہ ظفر نے رنگون کے زمانے میں کہے(۲۶)۔ اس تمام گفتگو سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ بہادر شاہ ظفر کے کلام کی تحقیق اور تدوین جس انداز میں کی جانی چاہیے تھی، ابھی تک نہیں ہو سکی ہے۔ بہرحال ان کا جس قدر حبسیہ کلام اب تک دستیاب ہو سکا ہے اس کی روشنی میں ظفر کا مرتبہ بحیثیت ایک زندانی شاعر متعین کیا جا سکتا ہے۔

جدوجہد آزادی میں بہادر شاہ ظفر کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی اور مجاہدین ان کی ذات میں گم شدہ دور سلطنت کو مجسم دیکھتے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی اس دور کے متعدد شاعر اور اہل قلم ایسے ہیں جنہوں نے اجنبی اقتدار کے جوئے کو اپنی ناتوانی کے باوجود پوری قوت سے اتار پھینکنے کی کوشش کی اور اس سعیٔ ناکام کے نتیجے میں اپنی جانوں کی قربانی بھی پیش کی اور قیدوبند اور جلاوطنی کی صعوبتوں کو بھی برداشت کیا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شرکت کے جرم میں جن شعراء کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی ان میں مولانا فضل حق خیر آبادی کا نام بہت نمایاں ہے۔ مولانا کا انتقال ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں انڈمان ہی میں ہوا۔ منیر شکوہ آبادی اور مولانا فضل حق انڈمان میں ایک ہی جگہ مقیم تھے۔ منیر نے اپنا معرکتہ الآرا قصیدہ جو مصطلحات عجم میں ہے مولانا ہی کی فرمائش پر نظم کیا تھا۔ انڈمان کے قیام کے دوران علامہ خیر آبادی نے جو دو قصائد لکھے وہ عربی میں ہیں۔ انہوں نے ان قصائد کا نام "قصائد فتنہ الہند" رکھا۔ ان قصیدوں کو عبدالشاہد شیروانی نے اردو میں ترجمہ کر کے مولانا فضل حق خیر آبادی کی نثری تصنیف "الثورۃ الہندیہ" (باغی ہندوستان) کے ساتھ شائع کر دیا ہے(۲۷)۔ ان قصائد سے جنگ آزادی کے دوران پیش آمدہ مصائب اور دوران اسیری انہوں نے اپنی ناگفتہ بہ حالت کو بہت تفصیل سے بیان کا ہے۔ یہ دونوں قصائد نعتیہ ہیں اور عربی میں ہونے کی وجہ سے ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

جن لوگوں کی بدولت دہلی میں شعروسخن کی محفلوں کی رونق قائم تھی، ان میں نواب مصطفٰے خان شیفتہ بھی تھے۔ شیفتہ مومن کے شاگرد تھے۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں بجرم بغاوت ماخوذ ہوئے۔ سات سال کی سزا ہوئی لیکن دو تین ہفتے

ہی کے بعد رہائی مل گئی "کلیات شیفتہ وحسرتی" ۱۹۱۶ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئی۔ شیفتہ کے حبسیہ کلام کا علم نہیں ہو سکا۔

فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے جن اہل علم پر ظلم وستم توڑے ان میں مفتی صدرالدین آزردہ بھی شامل تھے۔ جنگ آزادی کے دنوں میں آزردہ دہلی میں صدرالصدور تھے۔ جہاد کے مشہور فتویٰ پر جن علماء کے دستخط تھے ان میں آزردہ بھی شامل تھے۔ چنانچہ سقوط دہلی کے بعد ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے مکانات ڈھا دیئے گئے' مال جائیداد سب کچھ برباد ہو گیا۔ مصنف "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" نے ان کے چند شعر نقل کئے ہیں جو اسی زمانہ کی تصنیف نظر آتے ہیں۔

روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی

○

عیش وعشرت کے سوا جن کو نہ تھا کچھ بھی یاد
لٹ گئے کچھ نہ رہا' ہو گئے بالکل برباد
ٹکڑے ہوتا ہے جگر سن کے یہ ان کی فریاد
پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھی دِلّی آباد (۲۸)

مفتی سید احمد بریلوی سنبھل ضلع مراد آباد کے قدیمی باشندے تھے مگر بریلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ فن شعر میں غالب کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء کے دوران آپ نواب خان بہادر خاں ناظم روہیل کھنڈ کی حکومت میں مفتی کے عہدہ پر سرفراز تھے۔ بریلی میں انگریزوں کا تسلط ہوا تو آپ کو کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی' انڈمان ہی میں انتقال ہوا۔ اسیری کے دوران انہوں نے اپنی رہائی کے لئے ایک منظوم عرض داشت بنام رسالت مآب تحریر کی جس کے چند بند یہ ہیں۔

قسم سے تجھے اے نسیمِ سحر
مری بیکسی پر ذرا رحم کر
میسر نہیں کوئی پیغام بر

مدینے میں ہووے جو تیرا گزر
تو میری طرف سے زمیں چوم کر
یہ کہنا بدرگاہِ خیرالبشر

بندھے بندِ آہن سے سب دست و پا
رہا بند یک چند آب و غذا
نہ سننا تھا جو کچھ وہ سب کچھ سنا
نہ ہونا تھا جو کچھ وہ سب کچھ ہوا
لٹا گھر، دیارِ وطن بھی چھٹا
چھٹے سب کے سب دوست اور آشنا

جہاں پر عیاں حسنِ اخلاق ہے
شاگر ترا آپ خلاّق ہے
ترے نام سے روشن آفاق ہے
تری ذات احسان میں طاق ہے
اسیری بہت اس پہ اب شاق ہے
یہ سید رہائی کا مشتاق ہے (۲۹)

مولوی ایوب خان نام اور کیفی تخلص تھا۔ کیفی جدوجہد آزادی میں نواب مجو مراد آبادی کے ساتھ تھے۔ جب مراد آباد پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو ایوب خان کیفی کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ملی۔ امیر مینائی کے بیان کے مطابق کیفی ۱۲۷۶ھ میں انڈمان گئے اور ''تذکرہ انتخاب یاد گار'' کی تالیف کے وقت (۱۲۹۶ھ) وہاں زندہ تھے(۳۰)۔ ۸ فروری ۱۸۷۲ء مطابق ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۸۸ھ کو جب گورنر جنرل لارڈ میو، جزیرۂ انڈمان میں شیر علی آفریدی کے ہاتھوں قتل ہوا تو کیفی نے بیس اشعار کا ایک قطعہ تاریخ لکھا جس کو محمد جعفر تھانیسری نے اپنی کتاب ''تواریخ عجیب'' میں نقل کیا ہے۔ چند شعر یہ ہیں۔

عمدۂ لندن، گورنر جنرلِ ہندوستاں
قیدیوں کی پرورش کو لائے تشریف انڈماں
پنج شنبہ فروری کی آٹھویں تاریخ تھی
روزِ محشر سے وہ شب پیدا ہوئی تھی الاماں
آفریدی شیر علی نے چھوری سے بسمل کیا
نیل کا ٹیکا لگایا قیدیوں پر جاوداں (۳۱)

ان اشعار میں دلی جذبات پر مصلحت کوشی غالب ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت تک مولوی محمد ایوب کیفی کے خیالات ہی میں تبدیلی آگئی ہو۔ کیفی کو تاریخ گوئی سے بھی خاص لگاؤ تھا، چنانچہ ان کی بعض دوسری تاریخیں بھی جو انہوں نے انڈمان کے دوران کہیں دستیاب ہو جاتی ہیں۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری کی تصنیف "تواریخ عجیب" میں ایک مختصر نظم خالق باری کی طرز پر کہی ہوئی شامل ہے۔ شاعر کا نام چمن خاں ہے جس کے حالات زندگی کا علم نہیں ہو سکا۔ نظم سے اس زمانہ میں نکوبار میں بولی جانے والی زبان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔(۳۲)اس نظم کی قدروقیمت دوسری متعدد خالق باری کے انداز میں لکھی جانے والی نظموں کی طرح محض درسی اور نصابی ہے۔ اس سے انڈمان کی جلاوطنی کی زندگی یا خود شاعر کے کسی قسم کے دلی تاثرات کا علم نہیں ہوتا۔

قاضی سرفراز علی شاہ جہاں پوری المتخلص بہ سید، منشی اکبر زماں اکبر آبادی المتخلص بہ مجید، نواب قادر علی خان رئیس شاہ جہاں پور بھی دوسرے شعراء کے ساتھ انڈمان میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ان شاعروں نے ایام اسیری میں بھی فکر سخن کا سلسلہ قائم رکھا مگر ان کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ خونیں میں عام لوگوں کے علاوہ شعراء بھی کثیر تعداد میں شریک تھے۔ بظاہر یہی خیال ہوتا ہے کہ برصغیر کی تاریخ کے اس پرآشوب دور میں حبسیہ شاعری میں گراں قدر اضافہ ہوا ہو گا لیکن جب حبسیہ شاعری کے نقطۂ نظر سے اس عہد کی تخلیقات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ ملک گیر دار وگیر کے باوجود حبسیہ شاعری میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا جس کی سب سے بڑی اور واضح وجہ یہ ہے کہ ان شعراء کو گرفتار کرنے کے فوراً" بعد پھانسی کی سزا دیدی گئی یا گولی مار دی گئی۔ ان کو یہ موقع ہی نہیں ملا

کہ وہ قید وبند میں رہ کر اپنے تاثرات وجذبات کا اظہار کر سکیں۔ صرف مولانا کفایت علی کافی کے چند اشعار ملتے ہیں جو وہ پڑھتے ہوئے قتل گاہ کی طرف گئے۔

کوئی گل باقی رہے گا' نے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دینِ حسن رہ جائے گا
ہم صفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائے گا
اطلس و کم خواب کی پوشاک پر نازاں نہو
اس تنِ بے جان پر خاکی کفن رہ جائے گا
نامِ شاہانِ جہاں مٹ جائیں گے لیکن یہاں
حشر تک نام و نشانِ پنجتن رہ جائے گا
جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائے گا
سب فنا ہو جائیں گے کافی ولیکن حشر تک
نعتِ حضرتؐ کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا (۳۳)

مولانا کافی کا تعلق مراد آباد سے تھا۔ یہاں کے جن لوگوں نے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا مولانا کافی ان میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کو علوم عقلیہ ونقلیہ میں کمال دسترس حاصل تھی۔ وہ اپنے دور کے مسلم الثبوت اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا کافی' شیخ مہدی علی خان ذکی مراد آبادی کے شاگرد تھے۔ کافی صاحب دیوان شاعر ہیں۔ نعتیہ شاعری میں ان کو خاص مقام حاصل ہے۔ جو اشعار مرتے دم ان کی زبان پر تھے ان پر ان کے عقیدہ کی چھاپ بہت گہری ہے۔ وہ دنیوی حیات مستعار کو ایک حقیر شے تصور کرتے تھے اور اس کے مقابلہ میں ان کے نزدیک حیات اخروی ہی سب کچھ اور قدر کے لائق ہے۔

برجیس قدر' نواب واجد علی شاہ کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد جب لکھنؤ میں انقلابی فوج کا زور بڑھا تو شہزادہ برجیس قدر کو انہوں نے بادشاہ کا قائم مقام

بنا دیا۔ لیکن جب شاہی فوج کو شکست ہوئی تو شہزادہ برجیس قدر اپنی والدہ کے ہمراہ نیپال میں پناہ گزیں ہو گئے۔ صاحب تاریخ اودھ نے شہزادہ کے دور جلاوطنی کی ایک غزل نقل کی ہے جس میں وطن سے دوری اور بے کسی کے جذبات کی کسک موجود ہے۔

فرقت نصیب رہتا ہے جس نازنیں سے دور
یارب نہ کیجیو مجھے اس مہ جبیں سے دور
بلبل تو ہوں پر ایک گلِ یاسمیں سے دور
برجیس ہوں مگر بتِ زہرہ جبیں سے دور
ہوتا نہیں اثر ترے دل میں تو سنگدل
یاں تیرِ آہ گزرا ہے عرشِ بریں سے دور
ہے شکرِ کردگار عقوبات سے بچے
خالق نے کر دیا مجھے تاج و نگیں سے دور
تن خاک تیری راہ میں، سر بھرِ نذر ہے
کس طرح جاؤں جان! تری سر زمیں سے دور
مٹی خراب ہو گئی نیپال میں مری
رہتا ہے کیوں مزارِ امامِ مبیں سے دور (۳۴)

انیسویں صدی کے چھٹے اور ساتویں عشرے کو اردو میں حبسیہ شاعری کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہیے۔ اس دور تک حبسیہ شاعری کے زاویۂ نظر سے جو شاعر توجہ کے مستحق ہیں ان میں واجد علی شاہ اختر اور بہادر شاہ ظفر کے علاوہ ایک نام منیر شکوہ آبادی کا بھی ہے۔ منیر نے پہلے پہل تقریباً" نو ماہ کی مدت باندہ کی جیل میں بسر کی۔ وہ نومبر ۱۸۵۹ء سے جولائی ۱۸۶۰ء تک (مطابق ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ تا ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ) قید خانے میں رہے۔ ۶ جولائی ۱۸۶۰ء کو ان کے لیئے کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی جس کے بعد سے الہ آباد سے کلکتہ تک کا پیدل سفر کرکے منیر یکم محرم ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ھ کے بعد کسی دن انڈمان پہنچے جہاں ان کا قیام ۱۳ صفر ۱۲۸۲ھ مطابق ۸ جولائی ۱۸۶۵ء تک رہا۔ گویا قید زنداں باندہ سے انڈمان سے رہائی تک جو کچھ بھی انہوں نے

غزلیات اور دیگر منظومات کی صورت میں کہا ہے منیر کے ان احساسات و تجربات کا ترجمان ہے جس سے وہ زنداں کی چار دیواری اور انڈمان کی جلاوطنی کے دوران گزرے۔ منیر کے خطوط اور بعض دیگر داخلی شواہد کی روشنی میں ان کی درج ذیل غزلیں ایام اسیری کی یادگار ہیں۔

راہ میں صورتِ نقشِ کفِ پا رہتا ہوں
ہر گھڑی بننے بگڑنے کو پڑا رہتا ہوں

○

جاں باز ترے عشق میں ہر وقت کڑے ہیں
جب غیروں سے بگڑی ہے نصیب ان کے لڑے ہیں

○

سر کاٹنے کی تیغِ ادا کو خبر نہ ہو
یوں جان لیجئے کہ قضا کو خبر نہ ہو

○

قید میں مثلِ خوشی صبر کیا غم کو بھی
عید کیا چیز ہے رو بیٹھے محرّم کو بھی

○

پاؤں کو دیتی ہیں رنگِ خوں ہماری بیڑیاں
جنگلوں میں کر رہی ہیں لالہ کاری بیڑیاں

○

طبیعت میرے گل کی تیری زلفوں نے پھنسائی ہے
ہما ایسا ملا ہے تیرے طالع کی رسائی ہے

○

سب کہتے ہیں حور ہو' پری ہو
کچھ ہم بھی کہیں جو آدمی ہو

تلخ کامی بسکہ دنیا کا وتیرا ہوگیا
صرف زہرِ نزع کا بھی سب ذخیرہ ہوگیا

○

رہنے دو باتیں زوالِ حسن پورا ہو گیا
آیتوں کو کیا کریں منسوخ سورا ہو گیا

○

شادی ہے دخترِ رز سے کسی دیں پرست کی
توبہ کے گھر میں بجتی ہے نوبت شکست کی

○

صرف جو گنجینۂ کلام نہ ہوگا
زخمِ دہن، رہنِ التیام نہ ہوگا

○

راست بازی کو تمہارا بانکپن لے جائے گا
آدمیت لوٹ کر یہ راہزن لے جائے گا

○

تیغِ نگاہ آپ کی ہر طرح قہر ہے
بے کھائے جان جاتی ہے، کھائیں تو زہر ہے

○

کوچۂ جاناں ہے ارم کی طرح
دخل نہیں ہے مجھے غم کی طرح

○

کیا دیکھوں میں حسینوں کو خوفِ رقیب سے
روزِ وصال کم نہیں یومِ عصیب سے

○

ترے رخ سے زلف جو سرکی ہے، یہ ہوا دعائے سحر کی ہے
شبِ قدر دودِ جگر کی ہے کہ کمند بامِ اثر کی ہے

○

حالِ سابق نہ کہے اے دلِ دانا کوئی
اگلی باتوں سے پھر آتا ہے زمانا کوئی

آغا حیدر قلی خاں نے اپنے تحقیقی مقالہ میں منیر کی درج ذیل غزلوں کو دوران قید کی تصنیف قرار دیا ہے۔

اک روز بھی نہ کوچے میں اس کے گزر ہوا
سو مرتبہ زمانہ ادھر کا ادھر ہوا

○

بختِ خفتہ کا ٹھکانہ کوئے جاناں میں نہ تھا
خوابِ غفلت کا گزر چشمِ نگہباں میں نہ تھا (۳۵)

ان غزلوں میں کچھ اشعار ایسے ضرور ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ یہ غزلیں بھی منیر نے ایام اسیری ہی میں لکھی ہوں گی۔ دراصل منیر نے تقریباً" چھ برس کی مدت (نومبر ۱۸۵۹ء تا جولائی ۱۸۶۵ء مطابق ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ تا صفر ۱۲۸۲ھ) قید و بند میں گزاری۔ اس طویل عرصہ میں منیر نے بہت کچھ کہا ہو گا لیکن جب تک کوئی قطعی داخلی یا خارجی شہادت کسی غزل کے بارے میں نہیں ملتی کہ یہ اشعار دوران اسیری لکھے گئے اس قسم کی قیاس آرائی کے اظہار میں محتاط رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ تاہم منیر کی جو غزلیں یقینی طور پر زنداں کی تخلیق ہیں وہ صنف غزل کے حوالے سے ان کی حبسیہ شاعری کے مزاج کے تعین کے لئے کافی ہیں۔

غزلیات کے علاوہ منیر نے بعض دوسری اصناف میں بھی اپنی حبسیہ زندگی کے واقعات و حالات کی طرف بڑے واضح اشارے کئے ہیں۔ ان اصناف کی تفصیل درج ذیل ہے۔

قصائد

جب افیونِ شب سے ہوا چرخ تائب
ہوئی تخمِ خشخاشِ انجم بھی غائب

(قصیدہ "شمس المناقب" در منقبت حضرت حسینؓ)

رخِ احباب سے ظاہر ہوا ہے بغضِ پنہانی
صفائی کے گواہوں میں ہے کاذب صبح پیشانی

(قصیدہ "فریاد زندانی" درنعت حضرت سرور کائناتؐ)

حبّذا اے تیغِ تیز' اے مالکِ ملکِ رقاب
اے فروغِ جوہرِ آتش' صفائے طبعِ آب

(قصیدہ "ذوالفقار حیدری" درمنقبت حضرت علیؓ)

گزری شبِ سیاہ' تجلّی ہے نور کا
پڑھیے نمازِ صبح کہ تڑکا ہے نور کا

(قصیدہ بہ مدح جناب سیدۃ النساء حضرت فاطمتہ الزہرہؓ)

اشکِ زلیخا ہوئے بحر صفت موجزن
غرق ہوا نیل میں یوسفِ گل پیرہن

(قصیدہ "در مدح حضرت حسنؓ" بہ فرمائش فضل حق خیرآبادی)

بارے آئی نجات کی باری
کھل گیا عقدۂ گرفتاری

(قصیدہ بہ مدح منشی احمد حسن خاں عروج)

یہ قصیدہ منیر نے انڈمان سے رہائی کے بعد ہندوستان آتے ہوئے جہاز پر کہا۔ اس سے انڈمان کی زندگی کی بعض تفصیلات کا علم ہوتا ہے۔

قطعات

۱۔ قطعہ تاریخ مصائب قید و حالات زنداں۔

۲- قطعہ تاریخ در حال سرقت لباس پوشیدنی-

۳- قطعہ تاریخ حالاتِ تلامذہ

۴- قطعہ تاریخ رسیدن خود در ہندوستان-

رباعیات

۱- رباعیات خارش-

۲- رباعیات در سامان مفلسی زندان دریائے شور-

آغا حیدر قلی خاں منیر کے قصیدہ "فوز عظیم" کو منیر شکوہ آبادی کے جسیہ کلام میں شامل سمجھتے ہیں (۳۶) لیکن یہ قصیدہ عام معاشی پریشانیوں کے دوران لکھا گیا ہے ورنہ وہ کشادگیٔ رزق کی التجا نہ کرتے- قصیدہ کے یہ اشعار توجہ طلب ہیں-

منیر ایک نگاہِ کرم کا خواہاں ہے
کہ شاد کام ہو دل، دور ہو عذابِ الیم
وہ جائزہ جو ملا دعبلِ خزاعی کو
زیادہ اس سے ہے خواہاں یہ خانہ زادِ قدیم
خدا کے واسطے امداد کیجئے جلدی
کہ ضیقِ رزق سے ہوں مبتلائے کربِ عظیم

روایت یہ ہے کہ جب امام ہشتم امام موسیٰ رضا کے سامنے دعبل خزاعی نے اپنا قصیدہ آپ کی مدح میں پڑھا تو آپ نے اُس کو سو اشرفیاں اور اپنا رومال و جبہ عطا فرمایا جس سے اس شاعر کی غربت دور ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی اس کو دین ودنیا میں سرفرازی ملی- اس قصیدہ میں منیر نے اس روایت سے کام لیتے ہوئے اپنے ممدوح سے مدد کی درخواست کی ہے-

۱۸۵۷ء سے قبل اور اس ناکام جدوجہد کے نتیجہ میں اس کے بعد زنداں میں شب وروز

حیات بسر کرنے اور اس جاں گسل ماحول میں اپنے جذباتی ردعمل کا اظہار کرنے والوں کی تعداد جس قدر بھی ہے ان میں صرف تین شاعر ایسے ہیں جنھوں نے زیادہ بھرپور انداز میں حبسیہ شاعری کی یا یوں سمجھئے کہ یہ وہ شاعر ہیں جن کا حبسیہ کلام بڑی حد تک محفوظ رہا اور ہم تک پہنچا۔ ہماری مراد نواب واجد علی شاہ اختر، بہادر شاہ ظفر اور منیر شکوہ آبادی سے ہے۔ ان تینوں شعراء کا کلام ہمیں اردو کی حبسیہ شاعری کے دور آغاز کے مطالعہ کے لئے مناسب مواد فراہم کرتا ہے۔ یہی شاعر ہیں جنھوں نے اردو کی حبسیہ شاعری کی بعض روایات کی بنیاد رکھی اور اس اعتبار سے اس خاص شاعری کے امتیازی خدوخال متعین کئے۔

جلاوطنی کے عرصہ میں اور فورٹ ولیم کالج میں اسیری کے دنوں میں واجد علی شاہ کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو سمجھنے کے لئے ان کی مثنوی "حزن اختر" سے زیادہ ان کے وہ خطوط ہماری مدد کرتے ہیں جو انھوں نے مختلف اوقات میں اپنی بیگمات کے نام لکھے۔ یہ خطوط "مخزن اسرار سلطانی" اور "تاریخ ممتاز" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان خطوط میں ان کی کچھ غزلیں بھی مندرج ہیں جو ایام اسیری کی یادگار ہیں۔ خطوط کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ قید وبند میں حال کے جا نگسل لمحہ کی چبھن کو چند خوابوں کے سہارے دور کرنے کی سعیٔ لا حاصل میں مصروف رہے۔ وہ خود فریبی کے سایوں سے ایک لمحہ کے لئے بھی باہر نکلنے پر آمادہ نہیں، اسی لئے وہ اپنی موجودہ حالت کو چند لوگوں کی ساز باز کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کا کھویا ہوا اقتدار بحال ہو جائے گا۔ ان میں سیاسی بصیرت ہوتی تو وہ سمجھتے کہ انگریز ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنے اقتدار کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتا جا رہا ہے۔ ان کی جلاوطنی کی زندگی ایک تلخ حقیقت ہے جو تا دم مرگ ختم ہونے کا نام نہیں لے گی۔ وہ وقتی تلذذ کو زندگی کا حاصل سمجھتے تھے۔ وہ اگر بیتاب اور بیقرار ہیں تو اس لئے کہ اب ان کو دادعیش دینے کے وہ مواقع حاصل نہیں رہے جو پہلے کبھی ان کی دسترس میں تھے۔ نواب اکلیل محل کے نام ایک خط محررہ ۲۲ ذی قعد ۱۲۷۵ھ کی ابتدائی سطور ان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو اس طرح پیش کرتی ہیں۔

"بعد معانقۂ ابدان روحانی اور ارواح جسمانی، بلبل قلم کو ترانہ سنج دعا کرتا ہوں۔ تمہارے تپ فرقت سے مرتا ہوں" (۳۷)

ایک اور خط میں جو ۱۵ صفر ۱۲۷۳ھ کو لکھا گیا' اپنا حال یوں بیان کیا ہے۔

"ہر دم آہ سرد بھرتا ہوں۔ کروٹیں لے لے کر صبح کرتا ہوں۔ دیکھنے والے روتے ہیں' منہ آنسوؤں سے دھوتے ہیں۔ شوق وصال ہر دم ترقی پر ہے۔ ولولۂ بوس و کنار شرح سے باہر ہے" (۳۸)

یہ کیفیت کسی خاص مکتوب تک محدود نہیں بلکہ کم وبیش ہر خط میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد باقر' لکھنؤ سے تقریباً" ایک ہزار میل دور بیٹھ کر ایک محبوب بیگم سے معانقۂ جسمانی اور تمنائے مواصلت کی خیال انگیز آرزو کا اظہار کرنا تلذذ کی نادر مثال ہے(۳۹)۔ تلذذ کا جذبہ ان غزلوں میں بھی کارفرما ہے جو نواب واجد علی شاہ نے اکلیل محل کی تعریف میں لکھی ہیں۔

باعثِ راحت و عیش و طرب و لطف و سرور
خوش قرینہ ہے' مری جان ہے زینب بیگم
جلد تر اس کو الٰہی کہیں وصلت ہو نصیب
ہجر میں دل میرا نالاں ہے زینب بیگم
روئے خورشید ہے پنڈلی تری اے مایۂ ناز
رشکِ مہتاب تری ران ہے زینب بیگم (۴۰)

واجد علی شاہ جلاوطنی کی زندگی میں ایام گزشتہ کی پربہار یادوں کے سہارے زندہ تھے جن کو وہ اپنے تصور کی مدد سے ایک لمحہ کے لئے بھی خود سے جدا نہ ہونے دیتے تھے۔

"کیا کہوں وہ تمہارا سکندر باغ کا رہنا اور ہمارا پروانہ وار گاڑی پر دن دن بھر تمہارے ساتھ پھرنا اور ڈومنیوں کا مجرا کرنا اور راتوں کو چبوترے پر بسر کرنا اور نوبت کی صدائیں اور شہنا کی آوازیں یہ سب شبانہ روز آنکھوں کے تلے پھرتا ہے"۔(۴۱)

"لو پھر میں اب سوار ہو جاؤں۔ تمہارے واسطے بھی گاڑی جوت کر تیار کروا منگواؤں۔

کو جوانوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھوادوں - جواناں چمن پھر رہے ہیں کوئی قصہ پڑھ کر انہیں بھی کھسکا دوں- آب شبنم سے برگ درختاں دھو جائیں- ملکہ عالمیان سلامت اب ہمارے تمہارے وصل کے موقع ہو جائیں- حمام سکندر باغ تیار رہے- حکم دیجئے تو خزانے کا پانی حوض کی تہہ میں بہے"-(۴۲)

ان خطوط میں واجد علی شاہ نے چھ غزلیں بھی درج کی ہیں جو انہوں نے اپنی بیگم نواب اکلیل محل کے لئے لکھیں- یہ غزلیں واجد علی شاہ کے حبسیہ کلام میں شامل ہیں- چار غزلیں جو نواب اکلیل محل کی تعریف میں ہیں اور جن میں سے ایک غزل کے تین شعر ہم نے اوپر لکھے واجد علی شاہ کے ان ہی جذبات کی آئینہ دار ہیں جن سے ان کے یہ خطوط مملو ہیں- باقی دو غزلوں میں واجد علی شاہ نے اپنی محرومیوں کا بیان کنایتا" کیا ہے مگر ان شعروں میں وہ کسک نہیں جو بہادر شاہ ظفر کے شعروں میں موجود ہے- واجد علی شاہ پر قید کا زمانہ سخت ضرور گزرا مگر انہوں نے وہ شدائد نہیں دیکھے جن سے اس آخری مغل فرماں روا کو گزرنا پڑا- تاہم ان کا عرش کی بلندی سے یک بیک فرش نشین ہو جانا کسی شدید المیہ سے کم نہ تھا- مگر یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے اس صورت حال کو شدت سے محسوس ہی نہیں کیا- بس ایک ہی غم شب وروز ان کی زندگی پر محیط نظر آتا ہے کہ ان سے دادعیش کے وہ اسباب چھن گئے جو نظر بندی سے پہلے ان کو حاصل تھے- حبسیہ غزلوں کے چند اشعار دیکھئے جن میں اپنی بدنصیبی کا ماتم بھی ہے اور لکھنؤ کی بزم عیش کے برہم ہو جانے کا غم بھی-

چمن سے پھینک دیا میرا آشیاں کیا خوب
نہال مجھ کو کیا آکے باغباں کیا خوب

○

قفس میں بند ہوں بے بال و پر ہوں' دل دھڑکتا ہے
سبب ہے کون سا صیاد اب میری رہائی کا

○

نہ جلا خانۂ صیاد' نہ گل مرجھائے
اب نہ کچھ ہو گا ان آہوں کا اثر دیکھ لیا

نصیبوں پر ہمارے سنگ دل آنسو بہاتے ہیں
کرے گا شمع رُو کیا موم اپنی تیرہ بختی کو
اڑادے گی مثالِ کاہ و خس ہر چرخِ گرداں کو
گلا دے گی ہماری آہ پتھر کی بھی سختی کو
ہر ایک نالے سے امواجِ صبا پانی سی ہوتی ہیں
سمندر کردیا اشکِ الم دیدہ نے ندّی کو

○

دل پھڑک کر چپ ہوا گلشن کا عالم دیکھ کر
اے گلو! منقارِ بلبل وصف میں وا رہ گئی
دل کو ہم مجنوں صفت چھوڑ آئے کوئے یار میں
ناقہ آگے بڑھ گیا محمل میں لیلا رہ گئی
اے قمر طالع نہ کوٹھی پر ہوا تو وصل میں
شام کو بھی آرزوئے روئے زیبا رہ گئی
ہو گیا دل قیدیٔ زنجیرِ زلفِ مہ لقا
محفلِ عیش و طرب ساری مہیا رہ گئی
دم کی آمدشد ہے جیسے بادِ صرصر صبح کی
روح اب مثلِ چراغِ زیرِ داماں رہ گئی
کان کا یہ حال ہے مشتاق ہے آواز کا
آنکھ کی صورت یہ ہے حسرت سے دیکھا رہ گئی (۴۳)

داد عیش دینے کی حسرت کبھی کبھی ان کے حواس پر اس طرح چھا جاتی ہے کہ ان کو بجز اس کے دنیا میں کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ ان کی بعض غزلیں شروع سے آخر تک اسی بنیادی حیوانی جذبے

میں ڈوبی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

اے میری جاں، تو جانِ من، دل سے بھی سن
گل رو پری، سروِ چمن، دل سے بھی سن
مہ رخ تو ہے، اے جانِ جاں، رشکِ پری
رنگیں قبا، گل پیرہن، دل سے بھی سن
فی الفور ہو جائے شفا منہ دے ملا
میں ہوں مریضِ خستہ تن، دل سے بھی سن
آنکھوں کو رکھ پیشِ نظر، آ لیٹ جا
رخسار پر رخ، تن پہ تن، دل سے بھی سن
خوش بخت ہے، خوش رخت ہے، آ ادھر آ
لگ جا گلے سے سیم تن، دل سے بھی سن
ہمراہ سوؤں کوٹھی پر در بند کر
ٹھنڈی ہوا ہے جانِ من، دل سے بھی سن
پنجہ سے پنجہ، منہ سے منہ آ دے ملا
سینے سے تن، لب سے دہن، دل سے بھی سن (۴۴)

واجد علی شاہ کی حبسیہ شاعری میں ان کی سب سے اہم تصنیف ان کی مثنوی "حزن اختر" ہے۔ شاہ اودھ کو جن پریشانیوں، حالات وکیفیات سے دو چار ہونا پڑا ان کے پیش نظر ان کی اس آپ بیتی کو دردوغم کا مرقع ہونا چاہئے تھا مگر یہ دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ اس مثنوی پر بھی وہی رنگ چھایا ہوا ہے جو ان کے خطوط میں موجود ہے۔ مثنوی کے آغاز کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

پلا ساقیا وہ مئے سرخ رنگ
کہ ہو نشے سے جس کے دل کو امنگ
شرابِ مصفا کا اک جام دے
ذرا دخترِ رز کو یہ پیغام دے

کہ ہے طالبِ وصل اک بادہ خوار
ہے جامِ محبت کا اس کو خمار
مہینوں سے ہے طالبِ وصلِ یار
نہ زنداں میں پہنچی نسیمِ بہار
نہ آتی ہے جاں' نے نکلتا ہے دم
حجر ہو گئی رنج سے چشمِ نم
نہ تسکیں کو ہے پرتوِ آفتاب
تماشے کو آتا نہیں ماہتاب (۴۵)

ان شعروں میں جو جذبات بیان ہوئے ہیں وہی اس مثنوی کے پیکر میں روح کی مانند جاری وساری ہیں۔ دوران اسیری لکھی جانے والی اس مثنوی میں یقیناً" ایسے مواقع بھی آئے ہیں جب وہ قید وبند کی اذیتوں' زنداں کے شب وروز کی سختیوں اور ان کے نتیجہ میں دل وجاں میں برپا قیامت کو تفصیل سے بیان کر سکتے تھے لیکن یہ بیانات جہاں بھی ہیں بہت مختصر اور تنوع سے عاری ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کوشش شعوری ہو اور وہ اس قسم کے بیان کو طول دے کر انگریز کو ناراض کرنا نہ چاہتے ہوں کیونکہ وہ اب تک انگریزوں سے انصاف اور حسن سلوک کی امید رکھتے تھے۔ وہ جب بھی اس موضوع کی طرف آتے ہیں ان کے شعروں پر نوحہ کا سا گمان ہونے لگتا ہے جیسے ان میں دردوغم کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہی نہ ہو۔ جیسے وہ اس طرح انگریز حکام کے جذبۂ ترحم کو بیدار کرنا چاہتے ہوں۔ ویسے بھی ان میں دردوغم برداشت کرنے کا وہ حوصلہ نہ تھا جس کی جھلک ہمیں بہادر شاہ کی پر عظمت شخصیت میں نظر آتی ہے۔ مثنوی کا عمومی لہجہ نسائیت لئے ہوئے ہے' بعض شعر تو بالکل یوں لگتے ہیں جیسے کوئی خاتون ہم کلام ہو۔

رفیقوں نے چھوڑا اکیلا مجھے
سبھوں نے کوئیں میں دھکیلا مجھے
عیال اور اطفال لوٹے گئے
جہاں میں مرے لال لوٹے گئے

کوئی مضطرب ہے، کوئی نالہ کش
کوئی پیٹتا ہے تو آتا ہے غش
بدن تارِ مسطر سے مل مل گیا
کلیجہ مصیبت سے ہل ہل گیا
خدا رکھے ذات اس فلک قدر کی
بڑھے عمر و دولت بھی اس بدر کی
ہوئیں ٹٹیاں خس کی مجھ کو نصیب
الٰہی جلیں غم سے اس کے رقیب

○

مگر سارے گھر نے نہ چھوڑا مجھے
دبایا، ڈرایا، جھنجھوڑا مجھے
جو آجائے کوئی نہ تھی یہ مجال
مجھے زندگی ہو گئی تھی وبال

○

ارے دوڑو للہ لوگو چلو
اٹھاؤ، اٹھاؤ، اٹھاؤ، اٹھو (۴۶)

نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے جن اشعار میں قید خانے میں اپنے ضعف کی تصویر کھینچی ہے خود کو ایک ناز پروردہ نازنین کے روپ میں پیش کیا ہے۔

یہ احوالِ اعضاء ہے جیسے کباب
نہ زلفوں میں بل ہے نہ وہ پیچ و تاب
کلائی کا عالم یہ ہے کم ہوئی
کہ پنجہ جو گل سے کیا خم ہوئی

ہوئی غم سے ڈھیلی ہر اک پور پور
نہیں ہے نوالہ اٹھانے کا زور
وہ گردن جو تھی صاف تر نور سے
زنخداں جو تھے خوش نما حور سے
ہوئی سوکھ کر مثلِ انگشتِ نر
رہے شاخِ رنج و الم پر ثمر
یہ گالوں کا عالم ہے اے خوش خصال
ہوئے بدرِ کامل سے گھٹ کر ہلال
لویں کانوں کی دونوں مرجھا گئیں
گلِ تر کی کلیاں تھیں کمھلا گئیں
وہ سینہ جو تھا تختۂ نور سا
وہ مکھڑا جو تھا خوش نما حور سا
ہوئے اس قدر دونوں غم سے نحیف
کمیں میں ہوں جس طرح سے دو حریف
وہ زانو جو تھے رشکِ بدرِ منیر
تو وہ ہو گئے غم سے نانِ شعیر
وہ گرمی کا رخ سامنے کی وہ دھوپ
اڑاتی ہے ناطاقتی رنگ و روپ (۴۷)

○

یہ شعر پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کو "جان عالم" کا لقب واقعی موزوں تھا۔ مثنوی میں انتہائی دردوغم کا مقام وہ ہے جہاں انہوں نے اپنی والدہ نواب تاج آرا بیگم، اپنے برادر حقیقی مرزا محمد جواد علی اور بھتیجی رافت آرا بیگم کی پردیس میں وفات کا ذکر کیا ہے۔ پے در پے ناگہانی اموات کی اطلاع کسی طرح بھی واجد علی شاہ کے لئے ایک سانحۂ عظیم سے کم نہ تھی۔ اس پر یہ امید کی جا سکتی تھی کہ مرنے والے قریبی عزیزوں کا غم ان کے قلم سے پھوٹ بہے گا اور صفحۂ قرطاس پر درد محرومی کے ایسے نقش ابھارے گا جن کو دیکھ کر لوگ خون کے آنسو روئیں گے مگر یہ دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ جو مرثیہ انہوں نے مرنے والوں کا لکھا ہے، بہت رسمی اور بے جان ہے۔ اس میں مع تمہید شعروں کی کل تعداد ۲۲ ہے۔ غم محرومی سے زیادہ بیان واقعہ شاعر کے پیش نظر رہا ہے لیکن اس کے برعکس جہاں انہوں نے اپنے محلات کے حسن وجمال کا ذکر کیا ہے، ان کا قلم ان کے ناز و ادا کی تعریف کرتے کرتے نہیں تھکتا۔ اختر محل کے حسن صورت کا بیان دیکھئے۔

اودھ کی وہ ہے ملکۂ نیک نام
وہ گل مثلِ طاؤس ہے خوش خرام
غضب کی ہے چتون، غضب کی ہے چال
کہ ٹھوکر سے ہو کبک تک پائمال
گلِ گوش، خوشبو میں مثلِ چمن
نزاکت کا پتلا ہے گل پیرہن
چمن عارضِ سرخ سے شرمسار
وہ جوبن ہے گلشن کی جیسے بہار
فدا لالۂ سرخ اس لال پر
نضارت تصدق ہر اک گال پر
سمن بر فدا عشوہ و ناز پر
پری کو ہے رشک اس کے انداز پر

سرِ زلف مہرؤ ہے کالے کا پھن
غضب گات ہے اور غضب ہے پھبن
در و لعل و گوہر ہیں دنداں نہیں
عجب تر بھی ہے زنخداں نہیں
جو شانے کہوں قمقمے نور کے
تو الماس سے ہاتھ ہیں حور کے
کمر ہے سرابِ رہِ کائنات
ہر اک بات ہے جس طرح ہو نبات
سرِ مو نہیں فرق اس بات میں
کہ بالوں سے دھوکا ہوا رات میں
چمن نسترن کا ہے رودِ دہاں
دہن کب ہے شاعر کو ہے کچھ گماں
سراسر کمر پیچ در پیچ ہے
ٹٹولا بہت جب تو وہ ہیچ ہے
کشادہ جبیں، اخترِ صبح ہے
وہ ابرو ہر اک خنجرِ صبح ہے
چمن روئے گلرنگ سے شرمسار
فدا خالِ عارض پہ مشکِ تتار
سمن بر، سمن رو ہے، گل فام ہے
مہ و خور، پری حور، یہ نام ہے
کرن مہرِ تاباں کی ہر گال ہے
ہر اک بھوں نہیں رستمِ زال ہے
جفا جو نہیں، تند خو وہ نہیں
دہن اس طرح جس طرح انگبیں

سر افراز ہے سرو قد سے ... نہال
وہ الھڑ پنے کی غضب بول چال

وہ مہ پارہ ہے سترہ سال کی
نرالی پھبن پائی ہے چال کی (۴۸)

یہ داستان خاصی طویل ہے۔ یکے بعد دیگرے نو بیگمات کا ذکر اسی انداز میں کیا گیا ہے۔ جعفری بیگم کا ذکر جو واجد علی شاہ کی ممتوعات میں سے تھیں، خاصا طویل ہے۔ اپنی اس بیگم کے مزاج کی شوخی وطراری کو انہوں نے بہت مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔

کھنچیں اس طرح ابروؤں کی کمان
کہ کشتی کو حاضر ہیں دو پہلوان

حبابِ لبِ نہر ہیں چھاتیاں
یم وصل میں لہر ہیں چھاتیاں

سخن کش ہے، نازک ادا ماہرو
بڑی جنگ جو ہے، غضب تندخو

کھلنڈرا پنا ہر سخن میں عیاں
وہ اچپل ہے، چنچل ہے بانکی جواں

سخن میں درشتی، زبان سخت ہے
پۓ عاشقِ نیم جاں سخت ہے (۴۹)

اس تفصیل سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ واجد علی شاہ کو درد و غم سے کوئی طبعی مناسبت نہیں۔ ان کی زندگی حسن اور راگ سے عبارت ہے۔ اسیری میں ان کو اگر کوئی پریشانی ہے تو بس اتنی کہ وہ پہلے کی طرح دادعیش نہیں دے سکتے، اسی لئے رہائی کی آرزو دل میں رکھتے ہیں۔

عجب ہوں میں اک شاعرِ خستہ حال
سوائے محبت نہیں کچھ خیال

واجد علی شاہ کا یہ شعر ایک طرح سے اعتراف حقیقت کا درجہ رکھتا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ

حسن نسوانی اور راگ کا ذکر جب وہ چھیڑتے ہیں تو طوالت و تکرار کی حد تک اپنے بیان کو پھیلا دیتے ہیں۔ نواب نجستہ محل کی بے وفائی کے بیان میں التزاماً" انہوں نے اصطلاحات موسیقی سے کام لیا ہے۔ یہ اشعار ۳۷ کے لگ بھگ ہیں۔

اس تمام گفتگو کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ واجد علی شاہ کی حبسیہ شاعری میں نہ تو وہ گھٹن ہے جو ہمیں بہادر شاہ ظفر کے یہاں ملتی ہے اور نہ زنداں کی زندگی کی وہ تصویریں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ قید خانہ میں ان کی زندگی کس طور بسر ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں ان کے یہاں نہ تو وہ داخلیت ہے جو پڑھنے یا سننے والے کو بے چین کر دے اور نہ وہ خارجیت جو تاریخی اہمیت کی حامل ہو۔ ان کی حبسیہ شاعری سطحی قسم کی ہے جس پر خواب عیش چھایا ہوا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کا حبسیہ کلام جس حد تک مدون ہو سکا ہے اپنی الم ناک کیفیات کے سبب اردو کی حبسیہ شاعری میں ایک منفرد اور بلند مقام رکھتا ہے۔ یہ کلام بیشتر غزل کی ہیئت میں ہے جس کو بہادر شاہ ظفر نے اپنی داخلی واردات وکیفیات کے بیان کے لئے ایک موثر وسیلۂ اظہار کے طور پر برتا ہے۔ ان شعروں میں ہمیں ظفر کی مجروح شخصیت بے نقاب دکھائی دیتی ہے' ان کی زندگی جو جلاوطنی میں بسر ہوئی اپنی جگہ زنداں کی وہ بلند دیوار دکھائی دیتی ہے جس سے مسلسل ٹکرانے کے نتیجہ میں ان کے جسم و جاں فگار ہو چکے ہیں۔ ان کی غزل میں' زنجیر' قفس' صیاد' عندلیب اور چمن کی علامات محض روایت شعر کے طور پر نہیں آئیں بلکہ ان کا معنوی ربط ان کے ذاتی اور تاریخی حالات میں دور تک سرایت کئے ہوئے ہے۔

کیا طائرِ اسیر وہ پرواز کر سکے
جس میں نہ اتنا دم ہو کہ آواز کر سکے

○

نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کی
خوشی سے آئے تھے' روتے اس انجمن سے چلے

○

شاداب حیف خار ہوں' گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خوار' نخلِ مغیلاں نہال ہوں

ہوا ہے جوشِ گل سے' جوشِ وحشت' اسقدر پیدا
کہ ہر موجِ ہوا پہنے ہوئے زنجیر پھرتی ہے

○

خارِ حسرت قبر تک دل میں کھٹکتا جائے گا
مرغِ بسمل کی طرح لاشہ پھڑکتا جائے گا

○

مرغِ دل مت رو یہاں آنسو بہانا منع ہے
اس قفس کے قیدیوں کو آب و دانا منع ہے

ترسنے رہنے کی کیفیت (Tantilization) یوں تو بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ دونوں ہی کے یہاں موجود ہے۔ ظفر کے یہاں یہ کیفیت ایک آفاقیت لئے ہوئے ہے اور ان کے تمام کلام پر چھائی ہوئی ہے جبکہ واجد علی شاہ کے یہاں ان کی شدید ذاتی تلذذ پرستی نے اس میں گہرائی اور تاثیر نہیں پیدا ہونے دی۔ بہادر شاہ ظفر کے درد اور محرومی میں اپنائیت کا احساس ہوتا ہے جبکہ واجد علی شاہ کی محرومی قطعی طور پر ان کا ذاتی مسئلہ دکھائی دیتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا وہ کلام جو قیام رنگون کی یادگار ہے' ان کے پہلے کلام سے بالکل جداگانہ انداز رکھتا ہے۔ پہلے وہ سنگلاخ اور مشکل زمینوں اور ردیف و قوافی میں زور طبیعت صرف کرتے تھے۔ رعایت لفظی کے بغیر ایک قدم نہیں چلتے تھے مگر اب اس تصنع کی جگہ ایک خاص قسم کی درد مندی نے لے لی ہے۔ پرومیتھیس (۵۰) (Prometheus) کی طرح ایک مسلسل کرب ان کا مقدر ہے۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ' نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس کے ستم کا میں کیا بیاں' مرا غم سے سینہ فگار ہے

○

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلادیا
اسے آہ' دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

○

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے، میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

پےِ فاتحہ کوئی آئے کیوں، اور آکے پھول چڑھائے کیوں
کوئی آکے شمع جلائے کیوں، کہ میں بیکسی کا مزار ہوں

○

خواب تھی جو زندگی جاہ و حشم میں کٹ گئی
ورنہ اپنی عمر ساری درد و غم میں کٹ گئی

ان شعروں میں ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کی تلملاہٹ اور ایک مجروح شخصیت کے تاثرات پوری طرح نمایاں ہیں۔ وہ بھجن گائیں یا ہولی کہیں، دو ہے لکھیں یا حمد و نعت کے اشعار موزوں کریں، ان کے یہاں دل مضطر کی تڑپ ضرور کار فرما ہے۔ حالات کی ناسماعدت اور غیر ملکی جابروں کی ستم کیشی کا شعوری گلہ پوری شدت سے موجود ہے۔ اس خصوصیت کے اعتبار سے وہ اپنے دور کے سماجی حالات کی عبرت انگیز اور دلدوز کیفیات کو بھی اپنی شاعری میں سمو لیتے ہیں۔ حالات کے تقاضوں، زندگی کے تلخ تجربات و حقائق نے انہیں لفظی بازی گری کے دائرہ سے نکالا اور پُرتصنع خیال آرائی سے گریز کی راہ دکھائی کیونکہ وہ ان وسیلوں سے انکشاف حقیقت اور اظہار غم کی طرف راغب ہی نہیں ہوسکتے تھے۔ ان کے اشعار میں حالات کا رد عمل بھی ہے، ایک تلخی بھی اور اپنی بے بسی اور مجبوری کا شدید احساس بھی جس کو وطن اور اعزاء سے دوری نے اور بھی شدید کردیا ہے۔ لیکن یہ تلخ نوائی چونکہ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے اس لئے بڑی دل نشیں ہوگئی ہے۔ ظفر کی حبسیہ شاعری میں اگرچہ فی نفسہ، زنداں کی زندگی کی صعوبتوں کا براہ راست بیان نہیں مگر ان کیفیات کا اظہار ضرور ہے جو اس پرآشوب زندگی نے ان کے دل و دماغ پر مرتب کی تھیں۔ بہرحال ظفر ہماری تاریخ کے ایک اہم موڑ پر کھڑے ہیں جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

جہاں ویرانہ ہے، پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے
شغال اب ہیں جہاں بستے، کبھی رہتے بشر یاں تھے

جہاں چٹیل ہے میداں اور سراسر ایک خارستاں
کبھی یاں قصر و ایواں تھے، چمن تھے اور شجر یاں تھے
جہاں پھرتے بگولے ہیں، اڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اڑتی تھی دولت، رقص کرتے سیمبر یاں تھے
جہاں سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہرِ خاموشاں
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں اور شور و شر یاں تھے
جہاں اب خاک پر ہیں نقشِ پائے آہوئے صحرا
کبھی محوِ تماشا، دیدۂ اہلِ نظر یاں تھے
ظفر احوال عالم کا، کبھی کچھ ہے، کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

منیر شکوہ آبادی نے زندان باندہ میں اپنے مقدمے کی کارروائی کے دوران میں جو جو ذلتیں اور اذیتیں برداشت کیں وہ واجد علی شاہ اختر اور بہادر شاہ ظفر کو نہیں دیکھنا پڑیں۔

واجد علی شاہ نے لکھنؤ سے کلکتہ تک کا سفر بغرض استغاثہ کیا تھا۔ انگریزوں نے ان کو لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ جب میرٹھ اور دہلی میں افواج کے برگشتہ ہونے کی اطلاع کلکتہ پہنچی تو واجد علی شاہ کو مٹیا برج سے فورٹ ولیم کالج میں نظر بند کر دیا گیا جہاں وہ ۲۶ ماہ تک مقیم رہے (۵۱)۔اس حالت میں ان کی نگرانی ضرور کی جاتی تھی لیکن ویسے ان کو خدمت کے لئے ہر قسم کے ملازمین اور سامان میسر تھا۔ جدوجہد آزادی کا ہنگامہ فرو ہوا تو واجد علی شاہ دوبارہ مٹیابرج آگئے اور آخر وقت تک وہیں رہے۔ جن لوگوں نے مٹیابرج کو اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ جانتے ہیں کہ یہاں رہتے ہوئے معزول شاہ اودھ نے تا دم مرگ اپنی کسی عادت اور کسی شاہانہ عیش پرستی اور شغل میں فرق نہیں آنے دیا۔ گویا کلکتہ کا یہ علاقہ ہر طرح لکھنؤ کا نمونہ تھا۔ اس تمام تفصیل سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ واجد علی شاہ کی حبسیہ زندگی محض دو سوا دو برس کی نظر بندی اور خود اختیار کردہ جلاوطنی سے عبارت تھی۔

بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری ہمایوں کے مقبرہ سے ۲۱ یا ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو عمل میں آئی جس کے

بعد ان کو نواب زینت محل کے مکان میں زیر حراست رکھا گیا۔ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو مقدمہ کا آغاز ہوا اور ۹ مارچ کو اسی سال ان کے لئے حبس دوام کی سزا تجویز ہوئی - ۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو یہ شاہی قافلہ عازم کلکتہ ہوا جہاں سے ان لوگوں کو رنگون روانہ کر دیا گیا(۵۲)، گویا بہادر شاہ ظفر اپنی گرفتاری کے بعد مقدمہ کے فیصلہ تک کوئی پندرہ مہینے نظر بند رہے اور اس کے بعد رنگون میں چار برس جلاوطنی کی حالت میں بسر ہوئے۔

منیر شکوہ آبادی کی زندان باندہ میں ۹ ماہ کی قید بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ کی نظر بندی کے مقابلہ میں اس لئے شدید تھی کہ وہ کہیں کے حکمران نہ تھے بلکہ ایک غریب شاعر تھے۔ لہٰذا وہ سامان آسائش اور آرام کی مادی صورتیں ان کو کیسے ملتیں جو ان دونوں سابق فرماں رواؤں کو حاصل تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیدوبند کی اذیت ناک حالت کی جو تصویریں منیر کے حبسیہ کلام میں ملتی ہیں واجد علی شاہ اور بہادر شاہ ظفر کا حبسیہ کلام ان سے خالی ہے۔

منیر شکوہ آبادی کی حبسیہ شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ کلام جو باندہ میں مقدمہ کے دوران میں انہوں نے جیل کی کال کوٹھڑی میں تخلیق کیا۔ دوم وہ منظومات جو انڈمان میں جلاوطنی کی زندگی کی یاد گار ہیں۔ ایک اور طرح بھی اس حبسیہ کلام کی تقسیم ممکن ہے۔ پہلا جز حبسیہ غزلیات کا جس میں انہوں نے اپنے تاثرات، کیفیات اور جذبات کو ایک ایمائیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ دوسرا جز ان منظومات کا ہے جن میں ان کے قصائد، قطعات اور رباعیات شامل ہیں۔ موخر الذکر حصہ کلام چونکہ خارجیت لئے ہوئے ہے اس لئے اس میں قیدوبند کی زندگی بالخصوص انڈمان کی اذیت ناک زندگی کی تصویریں بہت روشن رنگوں میں ابھاری گئی ہیں۔ انڈمان کو چونکہ جدوجہد آزادی کی داستان میں ایک خاص مقام حاصل ہے اس لئے منیر کے اس بیان کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے۔

منیر کی حبسیہ غزلوں میں روایتی مضامین بکثرت ہیں جو ان کی پرگوئی کا نتیجہ ہے مگر ان خذف ریزوں میں ایسے موتی بھی موجود ہیں جن کی آب و تاب ان کے حقیقی داخلی جذبات کی مرہون منت ہے۔ اپنی بدنصیبی کے نتیجہ میں خوشیوں کی پامالی، دردوکرب کی افراط، دکھوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ، خواہش مرگ کے باوجود سخت جانی کے ستم، دل شکستگی و پریشانی، دوستوں اور عزیزوں کی ان کے حال سے غفلت اور عدم توجہی، اپنی کس مپرسی کی حالت اور ضعف و کمزوری کا

بیان، آنے والے زمانہ کی غیر یقینی صورت حال کے نتیجہ میں امید و بیم کی کیفیت، پھر گزشتہ یادوں کا ہجوم جو مایوسی کے عالم میں جینے کی امنگ کو کم نہیں ہونے دیتا اور ان تمام باتوں کے پہلو بہ پہلو وہ سماجی و تاریخی حالات جس کے سبب موج خوں ان کے سر سے گزری، غرض ان غزلوں میں جذبات و کیفیات کا ایک محشر بپا دکھائی دیتا ہے۔ بعض کیفیات ایک دوسرے کی نقیض بھی ہیں لیکن ان میں اس لئے تضاد نہیں کہ یہ اشعار بعض لمحاتی کیفیات کے تحت کہے گئے ہیں۔

درد و غم کی زیادتی

اے مہر جبیں ضعف میں بدلی نہیں کروٹ
سائے کی طرح ایک ہی پہلو سے پڑے ہیں

○

سوزِ دل میں نفسِ سرد جو کھینچا ہم نے
برد اطراف ہوا نارِ جہنم کو بھی
جانِ شیریں کی تمنا میں لگا رہتا ہے
چاٹ اس تحفہ مٹھائی کی پڑی. غم کو بھی
عید میں روتے ہیں، ہنستے ہیں محرّم میں اسیر
اپنے دن بھول گئے ہیں خوشی و غم کو بھی
غم زدے آپ ہی مرتے تھے ہوئے اس پر قید
طوق سے کام پڑا حلقۂ ماتم کو بھی
پیتے ہیں خونِ جگر پیٹ نہیں بھرتا ہے
کھا گئی تیرے ندیدوں کی نظر غم کو بھی

○

بند ہے دروازۂ آرام و راہِ عافیت
ہو گئیں زنجیرِ بابِ رستگاری بیڑیاں

○

صرف جو گنجینۂ کلام نہ ہوگا
زخمِ دہن، رہنِ التیام نہ ہوگا

○

میکدہ میں جا کے مرا دودِ آہ
پھیل پڑا ابرِ کرم کی طرح
تیغ مگر آپ کی ہے کوچہ گرد
پھرتی ہے رگ رگ میں یہ دم کی طرح

○

بیکس نہیں ہے بیوطنی میں کوئی بشر
دنیا کی آفتوں کو ہے صحبت غریب سے

○

غمِ عالم نے مرے دل میں جگہ کیونکر کی
ایک بستی میں سماتا ہے زمانا کوئی
کشورِ دل میں منادی یہی چلّاتے ہیں
غم کے ہوتے ہوئے کچھ اور نہ کھانا کوئی

اذیت پسندی اور خواہش مرگ

پائمالیٔ تمنا میں پڑے ہیں کب سے
ایک ٹھوکر تو کبھی راہِ خدا ہم کو بھی

○

جو بناتے ہیں چمن و مکاں، کرے عشق خاک گزر وہاں
نہ درِ جراحتِ دل جہاں، نہ گلی شگافِ جگر کی ہے
کبھی آنسو گرد ہیں راہ کی، کبھی دل ہے گود میں آہ کی
کوئی قبر نورِ نگاہ کی، کوئی لاش لختِ جگر کی ہے

○

سر کاٹنے کی تیغ ادا کو خبر نہ ہو
یوں جان لیجئے کہ قضا کو خبر نہ ہو

کیا فائدہ جو کھل کے مٹا صورتِ حباب
یوں نیست ہو کہ اصلِ فنا کو خبر نہ ہو
ٹھکرا کے پائمال کیا بھی تو کیا مزا
یوں پیسیئے کہ رنگِ حنا کو خبر نہ ہو
بے پردہ چٹکیوں میں اڑانا ضرور کیا
برباد یوں کرو کہ ہوا کو خبر نہ ہو

○

گلشنِ دنیا سے یارانِ عدم کے واسطے
خندۂ شادی، گلِ زخمِ بدن لے جائے گا
جاؤں گا دنیا سے رکھ کر دوشِ ظالم پر وبال
بوجھ میرا اپنے سر پر راہزن لے جائے گا

بدنصیبی اور پریشانی کا حال

زلفیں مری طرح ہیں پریشان ان دنوں
دیکھو برابری نہ کرو کم نصیب سے

○

دل میں جو آجائے خوشی ایک بار
قید کروں اس کو بھی غم کی طرح

○

روزِ سیہ کی اگر یونہی رہی آمد
صبح کو رخصت چراغِ شام نہ ہو گا

○

میری تقدیر سے ہو ہمسر
اتنی تری چال میں کجی ہو

○

میری تقدیر میں بل ڈال دے بالکل اے چرخ
پیچ ڈھونڈے نہ ملے گیسوئے پر خم کو بھی

یادِ عزیزاں و عمرِ گزشتہ

آنکھوں میں جان اس کی ہے وقفہ نہ کیجئے
یوں جلد آیئے کہ قضا کو خبر نہ ہو
سب سے چھپا کے بھیج دے اے جان بوئے زلف
جاسوسِ ہرزہ گردِ صبا کو خبر نہ ہو
چھٹکی ہے چاندنی مہِ داغِ فراق کی
اللہ میرے ماہ لقا کو خبر نہ ہو

○

کیا لطف دکھائے اے جوانی!
اللہ کرے تو جنتی ہو

○

حالِ سابق نہ کہے اے دلِ دانا کوئی
اگلی باتوں سے پھر آتا ہے زمانا کوئی
اے فلک یاد ہیں طفلی و جوانی کے مزے
اگلے عہدوں میں سے دے ڈال زمانا کوئی
سامنے آئے ذرا سوچ کے نیرنگِ جہاں
پھر رہا ہے مری آنکھوں میں زمانا کوئی

○

ہم سفرانِ رہِ الفت منیر
چھوٹ گئے نقشِ قدم کی طرح

○

سفری ہے یوسفِ دل ربا، مجھے آنکھوں سے نہیں سوجھتا
وہ جو پہلے نورِ نگاہ تھا، وہی گرد اس کے سفر کی ہے

○

آباد دل کیا ہے خیالِ حبیب سے
رکھا ہے میں نے مال چھپا کر نصیب سے
اب اپنی ہی قبا سے بغل گیر ہوتے ہو
آتی تھی آگے عید سبھوں کے نصیب سے

حالات زنداں و انڈمان

زندانِ غم کے حصہ میں ہیں اور سال و ماہ
آتی نہیں ہے عید جہاں یہ وہ شہر ہے
عمداً کیا ہے قافیہ میں اختلافِ قید
ٹاپو میں ہم ہیں اور محیط آبِ بحر ہے
عاشور اپنی وادیٔ غربت میں ہے مدام
اک روز سال بھر ہے جہاں یہ وہ شہر ہے

○

غربت میں کس سے چشمِ کرم کی امید ہو
آنکھیں چرا رہا ہے زمانہ غریب سے

○

خانۂ زنجیر ہے اس درجہ تنگ
جس میں ہوا رکتی ہے دم کی طرح

○

ہند سے یہ غل مچاتی آئیں تا دریائے شور
بحر و بر میں کر چکیں احکام جاری بیڑیاں
کالے پانی میں یہ کالی ناگنیں بھی بہہ گئیں
مارِ ماہی بن گئیں گویا ہماری بیڑیاں
دور کروادیں خدا نے انڈمن میں خود بخود
کرتی تھیں برسوں کی ناحق ذمہ داری بیڑیاں

○

قائم بھی، رواں بھی صفتِ منبع و چشمہ
دن رات سفر میں ہیں مگر پاؤں گڑے ہیں

○

قید میں سیر بھی کیا، پائیں جو لاکھوں آنکھیں
میں عبث دامِ مصیبت میں پھنسا رہتا ہوں
پر کھلے ہیں، نہیں پرواز کی صورت افسوس
میں قفس میں صفتِ قبلہ نما رہتا ہوں

سماجی حالات و معاشرتی اشارے

گیسوؤں والوں کی مٹی چرخ نے برباد کی
تودۂ مشک و عبیر، ان روزوں گھورا ہوگیا
بلبلوں کے بدلے ہے ہنگامۂ زاغ و زغن
کل جہاں انبارِ گل تھا، آج گھورا ہوگیا

○

آج کل قاضی ہے رشوت خوار، ٹھگ ہے محتسب
پاسباں سے جو بچے گا راہزن لے جائے گا

○

وطنِ خونِ شہیداں ہے اسی کشور میں
درمیانِ شفق آبادِ حنا رہتا ہوں

○

گھر سے جو نکلتے ہو تو دامن سے خبردار
گستاخوں کے لاشے ابھی کوچے میں پڑے ہیں

○

چھ سات برس میں یہ قیامت
تم بھی کوئی تیرھویں صدی ہو

○

نازک دلوں کو سنگِ ستم بھیجتا ہے چرخ
دعوت ہے روز شیش محل میں شکست کی

○

زنجیریں ڈالتے ہیں شہیدوں کے پاؤں میں
کشتوں کے کھیت ناپ رہے ہیں جریب سے

○

سرخ پوشی یہ ہوئی خونِ شہیداں سے عام
کالے کپڑے نہ ملے ماہِ محرّم کو بھی
بزمِ غم میں جو کوئی آئے تو زینت کرکے
شانۂ ارّہ مناسب ہے سرِ جم کو بھی

○

روٹھ کر بھاگے شب و روزِ جوانی مجھ سے
کالے گوروں کو منا لائے زمانا کوئی
حکمِ مفتیٔ ادا' شہرِ بتاں میں یہ ہے
خونِ ناحق ہو تو مہندی نہ لگانا کوئی

منیر کی یہ حبسیہ غزلیں، چونکہ صداقت احساس رکھتی ہیں اس لئے ان میں تاثیر بھی ان کی عام غزلوں سے زیادہ ہے۔ ان غزلوں میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن سے منیر کے سوانح اور شخصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان حبسیہ اشعار میں ایک کسک اور درد مندی موجود ہے مگر وہ دل شکستگی نہیں جو بہادر شاہ ظفر کی ان غزلوں میں ملتی ہے جو ان کے قیام رنگون کی یادگار ہیں۔ ظفر کو جن محرومیوں اور صدمات سے دوچار ہونا پڑا اور جو جو مظالم ان پر ڈھائے گئے، منیر تو کیا، اس دور میں کوئی شخص بھی ان سے دوچار نہیں ہوا۔ بقول راشد الخیری۔

"بہادر شاہ کی موت کو نہ معلوم کون سی موت کھا گئی تھی کہ دنیا مر رہی تھی لیکن اس کو موت نہ آتی تھی۔ شاہی مٹ چکی، حکومت ختم ہوئی۔ دولت کو آگ لگ گئی، عیش رخصت ہوا، مصائب کا توڑ، آفات کا نچوڑ، کس کس کا رونا رویا جائے۔ جوان جوان بیٹے آنکھوں کے سامنے خاک میں چلے گئے۔ کیسے کیسے دوست اور خیرخواہ قبروں میں جا پہنچے۔ لیکن زندہ رہا تو وہی کم بخت مصیبتیں جھیلنے اور آفتیں اٹھانے کو۔ اس حال میں کہ دیوانوں سے بدتر اور اس رنگ میں کہ فقیروں سے ابتر۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سنگ دل لڑکے کی طرح جو پرندے کو پکڑ کبھی اس کا پر نوچتا ہے اور کبھی ٹانگ، وقت بھی بہادر شاہ کو قسم قسم کی اذیتیں پہنچا کر تماشا دیکھ رہا تھا۔ (۵۳)

راشدالخیری کے اس بیان سے، بہادر شاہ ظفر کے لہجہ کی دردانگیزی اور اس کے محرکات کو باآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

حبسیہ غزلیات کے علاوہ، ان دوسری منظومات سے، جو زندان باندہ اور انڈمان میں ایام جلاوطنی کے دوران میں لکھی گئیں، ہمیں باندہ کی جیل میں منیر پر گزرنے والے شدائد، سزا کے بعد باندہ سے الہ آباد اور الہ آباد سے کلکتہ تک ان کا پیدل سفر(۵۴) اور پھر بعد میں انڈمان میں دوراسیری کے حالات کا علم ہوتا ہے۔ باندہ میں جو نو ماہ کی مدت گزری اس میں وہ تمام ذلتیں، بے انصافیاں اور ظلم و ستم منیر کا مقدر تھے جن سے جیل میں عام قیدیوں کو واسطہ پڑتا ہے، اس کے برعکس انڈمان میں اگرچہ طوق و زنجیر کی وہ گراں باری نہ تھی جو پہلے وہ باندہ میں برداشت کرتے رہے تھے مگر وطن سے دوری، دوستوں اور شاگردوں کی مفارقت ایسے صدمات تھے جن کا احساس اتنی شدت سے باندہ میں منیر کو نہیں ہوا تھا کیونکہ ان کے بعض شاگرد اور دوست زندان باندہ میں

ان کی خبرگیری کرتے اور ان کی تکالیف کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

منیر کو جب بہ جرم بغاوت، فرخ آباد میں گرفتار کر لیا گیا تو ہزار طرح کے ظلم و ستم ان پر روا رکھے گئے اور طرح طرح کی اذیتوں کے ساتھ ان کو فرخ آباد سے باندہ کے زنداں تک لایا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ان کے عزیز و اقارب اور دوستوں نے ان سے بے مروتی کا سلوک کیا، شاید اس میں خوف اور مصلحت دونوں ہی کارفرما ہوں مگر منیر کو اس بات کا قلق ضرور تھا۔

ہزاروں طرح کی جفائیں اٹھا کر
چلا قید ہو کر میں زنداں کی جانب
مری قید و تکلیف و ذلت کے باعث
اقارب اباعد، احباء اجانب

باندہ کے قید خانہ کی جس کوٹھڑی میں منیر بند تھے وہ بہت ہی تنگ و تاریک تھی۔ پیشاب پاخانے کی تکلیف بہت زیادہ تھی کیونکہ وہیں کوٹھڑی ہی کے ایک کونے میں بستر کے قریب یہ جگہ تھی۔ اس حالت میں نجاست اور تکلیف کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پانی نایاب تھا یہ حالت ہو تو تیمم اور وضو کیسے کیا جائے اور طہارت کیسے برقرار رہے۔ اس کے علاوہ منیر افیون کے بھی عادی تھے۔ قید خانہ میں ترک افیون کی تکلیف ناقابل برداشت تھی۔ جیل کے ملازمین ذرا سی بات پر گالیوں سے نوازتے، روٹیاں ایسی موٹی، کچی اور بدبودار ہوتیں جیسے آٹے سے نہیں گوبر سے تھوپی گئی ہوں۔ بجائے گندم کے ادنیٰ اور سستے قسم کے اناج کے آٹے سے روٹیاں تیار کی جاتی تھیں۔ ترکاری اگر کبھی پکتی تو بے مزہ اور کئی دنوں کی باسی ہوتی جو بالکل گھاس معلوم ہوتی۔ دال ایسی ہوتی جیسے گائے بھینس کی سانی اور اتنی سخت اور کچی ہوتی کہ اس کو چبانا ناممکن ہوتا۔ یہ پکی ہوئی دال بہت گندی، بدبودار اور بغیر نمک مرچ کے ہوتی، یہ ٹھنڈی دال کھانا پڑتی۔ جیل میں بچھانے کے لئے ٹاٹ اور اوڑھنے کے لئے کمبل تھا، گرمی کے دنوں میں جو حالت ہوتی ہوگی اس کا بس اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔ سردیوں میں یہ کوٹھڑی اتنی ٹھنڈی ہوتی کہ کپکپاہٹ شروع ہوجاتی۔ اس کے علاوہ دوسرے قیدیوں کی طرح منیر سے مشقت بھی لی جاتی۔ جیل کے وہ کارندے جو قیدیوں سے کام لیتے اور ان کی دیکھ بھال پر متعین تھے، انتہائی بدخصلت اور ظالم تھے۔ دھوکا فریب ان کی

کھٹی میں پڑا تھا۔ وہ طرح طرح سے بے قصور لوگوں کو اذیتیں پہنچانے کی کوشش میں لگے رہتے۔ گالیاں دینا اور برا بھلا کہنا ان کا معمول تھا۔ ان کے نزدیک نہ کوئی شریف تھا اور نہ کوئی صاحب علم و فضل۔ کمزوروں اور معصوم بچوں سے سخت کام لینا ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ نام کو بھی رحم کا جذبہ ان کے دلوں میں نہ تھا۔

باندھ کے زندان میں لاکھوں ستم
سہتے تھے ہم گردشِ تقدیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثلِ قبر
تنگ تر تھی، حلقۂ زنجیر سے
بول و غایط کی جگہ بستر کے پاس
تھی نجس تر، خانۂ خنزیر سے
پانی تھا نایاب مثلِ آبرو
چاہتے تھے خنجر و شمشیر سے
کیا تیمم، کیا وضو ممکن نہ تھا
کیسے طاہر رہتے کس تدبیر سے
ترکِ افیوں سے اذیت جو ہوئی
ہے فزوں اندازۂ تحریر سے
گالیاں تھیں کھانے کو یا زخم و داغ
تھا یہ حاصل مطبخِ تقدیر سے
روٹیاں گوبر کی گویا ملتی تھیں
نانِ گندم تھی سوا اکسیر سے
گھاس ترکاری کے بدلے تھی نصیب
خشک تر تھی سبزۂ شمشیر سے
بھینس کی سانی سے بدتر دال تھی
سخت دانہ، دانۂ زنجیر سے

کرکری، بدبو، کثیف و بے نمک
سرد تر وہ بھی مزاجِ پیر سے
تھا بچھونا ٹاٹ، کمل اوڑھنا
گرم تر پشمینۂ کشمیر سے
کوٹھری گرمی میں دوزخ سے فزوں
دست و پا بدتر تھے آتش گیر سے
کانپتے تھے موسمِ سرما میں یوں
جیسے عریاں سردیِ کشمیر سے
محنت و مزدوری و تکلیف و رنج
تھا زیادہ حیطۂ تحریر سے
اس جہنم کے مؤکل سب کے سب
دشمنی رکھتے تھے بے تقصیر سے
قاتلِ اشراف و اہلِ علم تھے
رنج پہنچاتے تھے ہر تدبیر سے
بے مروت، بے حیا، اہلِ دغا
کج طبیعت ہر جوان و پیر سے
ان کے ہونٹوں نے خلش کے واسطے
باتیں سیکھی تھیں زبانِ تیر سے
جعل میں، ٹھگ بدّیا میں بے بدل
نقدِ جاں تک چھین لیں تزویر سے
کاہ سے اٹھوائیں وہ کوہِ گراں
در نہ گزریں کودکِ بے شیر سے

یہ حالت اس وقت کی ہے جب منیرؔ زندان باندہ میں پابجولاں تھے۔ مقدمہ کا فیصلہ ہوا اور ان کے لئے کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی تو ان کو باندہ سے الہ آباد لایا گیا اور الہ آباد سے کلکتہ تک کا سفر

طوق و زنجیر میں بندھے ہوئے' پہرہ داروں کی نگرانی میں پیدل طے کرنا پڑا۔ اپنے اس سفر کی تفصیل سے جو منیر نے بیان کی ہے' پتہ چلتا ہے کہ قیدیوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ دوران سفر کیا جاتا تھا۔ وہی تذلیل جو قید خانہ میں ان کا مقدر تھی یہاں بھی ان کے ہم قدم رہتی۔ آہستہ چلتے تو نہ صرف گالیاں دی جاتیں' بلکہ مارپٹائی بھی ہوتی۔ بھوک پیاس اس پر مستزاد تھی۔ کھانے پینے کو کوئی معقول چیز نہ ملتی۔ غرض آرام کی صورت نہ سفرمیں تھی اور نہ منزل پر۔ کھنچی ہوئی تلواروں اور سنگینوں کے سائے میں پیادہ پا سفر' جسمانی اور روحانی دونوں لحاظ سے تکلیف کا باعث تھا۔ بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ایک طرح کا سامان تشہیر تھیں اور دیکھنے والے فوراً سمجھ جاتے تھے کہ یہ شخص جو اس طرح چل رہا ہے کوئی بدترین اخلاقی اور خوفناک مجرم ہوگا۔

برہنہ بدن' طوق و زنجیر پہنے
مشارق سے لیکر پھرا تا مغارب
پیادہ روی اور بُعدِ مسافت
ستم گار تلواریں کھینچے مراقِب
نگہبانوں کے جورِ دست و زباں سے
لکد کوب آلاف و رنج و نوائب
ادھر سخت آلام جوع و عطش کے
بلا اس طرف سب و شتم معاتب
منازل دہانِ ثعابین و ضیغم
مآکل ردی' سمِّ قاتل مشارب
سفر وہ کہ عینِ سقر بلکہ بدتر
نہ کسبِ منافع' نہ مشقِ تجارب

○

ننگی تلواریں کھنچی تھیں گرد و پیش
نوکیں سنگینوں کی بدتر تیر سے

جو الہ آباد میں گزرے ستم
ہیں فزوں تقریر سے، تحریر سے

پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں
گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے

ہتھکڑی ہاتھوں میں، بیڑی پاؤں میں
ناتواں تر قیس کی تصویر سے

راستے میں ظلم اعداء بے شمار
ہر گھڑی تھے شامتِ تقدیر سے

بے حواس و بے لباس و بے دیار
دل گرفتہ جورِ چرخِ پیر سے

نقشہ کلکتہ میں کھنچوایا مرا
رنگ منہ کا اڑ گیا تصویر سے

کلکتہ سے انڈمان تک کا بحری سفر بھی کم اذیت ناک نہ تھا' نمکین سمندر کا منظر دل کے زخم پر نمک چھڑکتا۔ وہ اگرچہ سفینے میں تھے مگر شور انگیز سمندر کی لہریں جب جہاز سے ٹکراتیں تو غرقاب ہونے کا ڈر دلوں پر غلبہ پالیتا۔ انڈمان کے شب و روز بے اندازہ اذیت میں گزرے' خراب آب وہوا اور ناقص غذا کے سبب بیمار پڑ جاتے تو کوئی علاج کی صورت نہ تھی۔ منیر نے اپنی ان منظومات میں انڈمان کی آب و ہوا' وہاں کے جغرافیائی حالات' قیدیوں اور وہاں کے اصل باشندوں کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے۔ منیر کہتے ہیں کہ یہ جزیرہ جو پہلے جنگل تھا' اب آدمیوں سے بھر چکا ہے۔ یہاں رہنے والے انسان کم اور دیو جن زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ قدیم بادشاہوں فرعون اور ہامان کے عہد کی یاد ان لوگوں کو دیکھ کر تازہ ہو جاتی ہے۔ ہر علاقہ کے لوگ یہاں آباد ہیں۔ چینی' برمی' ملائی' مدراسی' آسامی' تاتاری اور جنگلی جو یہاں کے اصل باشندے ہیں' بہت ہی شاطر اور چور ہیں' جو چیز ہاتھ لگے لے اڑتے ہیں (۵۵)۔ چینی' برمی اور عیسائی مردار اور سور شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ جزیرہ کہیں بہت پست ہے اور کہیں بہت بلند۔ جنگل گھنے اور تاریک ہیں پھر بھی دھوپ بہت تیز ہوتی ہے۔ سال میں نو مہینے پانی برستا ہے' برسات کے فوراً" بعد سردی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ انگریز جو یہاں مقیم ہیں' گرمی کی وجہ سے ان کی رنگت کالی پڑ چکی ہے۔ سمندر ساحل سے ٹکراتا ہے' اس شور کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔ اس پر مستزاد کوّوں' مینڈکوں اور کیکڑوں کی آوازیں رات بھر کان کے پردے پھاڑتی رہتی ہیں۔ سمندر کے کنارے مچھلیوں کی سڑاند سے ناک میں دم رہتا ہے۔ یہاں کا پانی بھاری اور ساحل کی مٹی نرم ہے۔ تیز آندھیاں چلتی ہیں تو درخت جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ حشرات الارض' سانپ' بچھوؤں' لبس کھپروں اور کھنکھجوروں کی کثرت ہے۔ بیماریاں عام ہیں اور دوا نایاب۔ من جملہ دوسری بیماریوں کے خارش کی تکلیف جان نہیں چھوڑتی۔ عام قیدیوں سے سخت محنت اور مشقت یعنی چکی پیسنا' لکڑیاں چیرنا اور مٹی کھودنے کا کام کرایا جاتا ہے اور اگر کوئی اس محنت شاقہ سے لب دم ہو جائے تو کوئی شخص بھی اس کے منہ میں پانی تک نہیں ڈالتا۔ منیر بتاتے ہیں کہ جن دنوں وہ انڈمان میں تھے' امیر اور غریب ہر طرح کے لوگ وہاں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں نایاب تھیں۔گویا اذیتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ اشیائے ضرورت اول تو نایاب تھیں اور اگر مل بھی جاتیں تو قیدیوں میں ان کو خریدنے کی استطاعت نہ ہوتی۔ دال روٹی مل جاتی تو زندانی اسکو اپنی

خوش نصیبی تصور کرتے۔ ارہر کی دال اور چاول کے سوا کوئی اور چیز کھانے کو میسر نہ آتی۔ گھی دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔ ابلی ہوئی دال کتے کی قے دکھائی دیتی۔ موٹے چاول ابل کر بھینس کی سانی کی طرح ہو جاتے۔ گوشت عنقا تھا۔ یہاں اگرچہ ہزاروں گندمی رنگ مصائب کی چکی میں پس رہے تھے مگر گیہوں کا آٹا پھر بھی نہ ملتا تھا۔ شکر اور گڑ بہت مشکل سے ہاتھ آتے۔ منیر نے انڈمان کے باشندوں، وہاں کے جغرافیائی حالات، موسم اور بیماریوں کی جو تفصیل اپنے حبسیہ کلام میں پیش کی ہے، وہ بہت حقیقی اور مبالغہ سے پاک ہے جس کی تصدیق بعض دوسرے ذرائع سے بھی ہو جاتی ہے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی جو انہیں دنوں منیر کے ساتھ وہاں موجود تھے، اپنی خود نوشت سوانح عمری میں ان جزائر کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> "پھر مجھے دریائے شور کے کنارے ایک ناموافق آب و ہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا ہے۔ اس میں دشوار گزار گھاٹیاں اور راہیں تھیں جنہیں دریائے شور کی موجیں ڈھانپ لیتی تھیں۔ اس کی نسیم صبح بھی گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی نعمت زہر ہلاہل سے زیادہ مضر تھی۔ اس کی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرررساں۔ ہر کوٹھری پر چھپّر تھا جس میں رنج و امراض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی تھیں۔ ہوا بدبودار اور بیماریوں کا مخزن تھی۔ مرض سستا اور دوا گراں۔ بیماریاں بے شمار، خارش و قوباء (وہ مرض جس سے بدن کی کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے) عام تھی۔ بیمار کے علاج، تندرست کے بقائے صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہ تھی۔ دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی الم ناک مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تام ہے۔ بہت سے مرض ایسے ہیں جن کا کتب طب میں نام و نشان نہیں" (۵۶)

انہی حقائق کا منظوم بیان، منیر کی حبسیہ شاعری میں ملتا ہے۔ بظاہر ان کے بیانات مبالغہ آمیز محسوس ہوتے ہیں لیکن جب انڈمان کے شب و روز کے بارے میں منیر کی پیش کردہ تفصیلات کی تصدیق دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے تو ان کی حقیقت نگاری کا نقش دل پر قائم ہو جاتا ہے، اسی لئے

منیر شکوہ آبادی کے قصیدہ "فریاد زندانی" پر تبصرہ کرتے ہوئے سید علی جواد زیدی نے بجا طور پر اس کو کالے پانی کے سیاسی قیدیوں کے شب و روز کی تصویر قرار دیا ہے۔ (۵۷)

زنداں و زندانی

پھنسے ہیں ایک جا ادنیٰ و اعلیٰ واہ ری قسمت
برابر خانۂ زنجیر میں ہے سب کی مہمانی

نکل کر ہند سے آنا ہوا جب اس جزیرے میں
اسیروں کی سیہ بختی سے کالا ہوگیا پانی

سوائے نیش زن زنداں میں مل سکتا نہیں کوئی
ہوئی ہے خانۂ زنبور میں دنیا کی مہمانی

بنائیں بیڑیاں تلواروں کو تڑوا کے گردوں نے
کیا ارباب جوہر کو ہر اک حیلے سے زندانی

بہادر نوحہ گر ہیں ماتمِ مرگِ شجاعت میں
بجائے نعرۂ شیرانہ سیکھے مرثیہ خوانی

ملوث ہو چلے اہلِ صفا بھی صحبتِ بد میں
نہیں رہنے کی آبِ صبح دم میں پاک دامانی

نکلوا کر وطن سے بھر دیا جنگل میں لاکھوں کو
جگہ رہنے کی اب پاتے نہیں غولِ بیابانی

نظر آئے ہزاروں دیو جن جس دن سے گھر چھوڑا
سوادِ شامِ غربت تھا مگر تختِ سلیمانی

سلاطینِ قدیمہ کی وفائیں ہاتھ آئی ہیں
بھری ہیں کوٹھیوں میں جنسِ فرعونی و ہامانی

کرو ارہ کشی یا مٹی کھودو، چکیاں پیسو
اگر ہو جاں بلب منہ میں نہ ٹپکائے کوئی پانی

"شبِ تاریک، بیمِ موج، گردابے چنیں حائل"
ہجومِ کربِ جسمانی، وفورِ رنجِ روحانی

○

زمانہ میں وادیٔ برہوت ہے وہ
جہاں ہم کو لایا ہے بختِ مغاضب
جزیرے میں جو جو اٹھاتا ہوں ایذا
نہ پائے شمار ان کا وہمِ محاسب
کئی سال اس قید و غربت میں گزرے
غم و غصہ و یاس و حرماں مصاحب

جزائر شور کے لوگ

جہاں دیکھو ہے اکل میت و خنزیر کی کثرت
حریص اس کے ہیں از بس چینی و برہما و نصرانی

○

چینی، برہما، ملائی، مدراسی
اہلِ آسام، جنگلی، تاتاری
اپنے دیدار سے معاف کریں
اپنی باتوں سے دیں سبک باری

○

یہاں کے چور وہ شاطر ہیں فنِّ دزدی میں
چرا لیں آنکھ، نہ سمجھے نگاہِ انسانی
جو دست برد دکھائیں وہ اپنی عید کے دن
اجل نہ پائے کبھی نقد جانِ قربانی
کمند و جست کی ہو احتیاج اگر ان کو
اڑا ہی لائیں رمِ آہوئے بیابانی

تونگری جو وہ پائیں کسی کی قسمت میں
چرالیں غیب سے مضمونِ خطِ پیشانی
سحابِ تیرہ بنیں یا کسوف بن جائیں
جو جامِ مہر میں سن پائیں سونے کا پانی
برہنہ مثلِ بہائم بنا دیا سب کو
اتار لے گئے بالکل لباسِ انسانی

طبعی ماحول

ہوئے ہیں جمع تحت و فوقِ دنیا اس جزیرے میں
بلندی اور پستی کی یہاں دیکھی فراوانی
بلندی پر چڑھے تو دار پر گویا چڑھے ناحق
جو اترے تو کنوئیں میں لے گری گویا گراں جانی
سیاہی جنگلوں کی ہے سفیدی گورے رنگوں کی
دو رنگی میں پھنسے ہیں روز و شب ٹاپو کے زندانی
سمجھ کر شورِ محشر اسکو مردے چونک پڑتے ہیں
یہ دریا شور کرتا ہے کہ ہوتا ہے جگر پانی
شب و روز اپنی قسمت پھوڑتا ہے سنگِ ساحل سے
مفیدِ قیدیاں ہو خاک پتھر اس کی طغیانی
ثقالت آبِ دریا میں ہے' نرمی ریگِ ساحل میں
کلیجہ پانی کا پتھر ہے' پتھر کا جگر پانی
برستا ہے برابر ابرِ دریا بار روز و شب
پھرا جاتا ہے سب کے مزرعِ امید پر پانی
ہوائے تند سے نخلِ فلک فرسا اکھڑتے ہیں
بہی جاتی ہے بارش کے سبب بنیادِ انسانی

عذابِ قومِ نوح و قومِ ہود آپس میں توام ہیں

نئی آب و ہوا ہے دعوتِ اصحابِ زندانی

وطن بس کھپروں کا، جاگیر ہے یہ مار و کژدم کی

کھلانا زہرِ قاتل ہے یہاں کی عین مہمانی

فغانِ خوکِ مخنوق و نعیقِ زاغ سنتے ہیں

یہی ہے راگ صبح و شام، ٹوڑی ہے نہ ملتانی

سحر تک شام سے غوغا ہے خرچنگ و ضفادع کا

محالِ ممتنع ہے دیدۂ مردم میں نیند آنی

وہ گرمی ہے یہاں جو ہند میں موسم ہے سردی کا

حرارت دھوپ کی ہے دوزخِ اجسامِ انسانی

گئی گرمی تو پھر برسات ٹھہری نو مہینے تک

اسی برسات سے ہے ہم بغل فصلِ زمستانی

یہاں اربابِ لندن کی بھی رنگت تیرہ ہوتی ہے

بنے مشکی اگر نقرہ دکھائے اپنی جولانی

○

مچھلیوں سے کہو کہ ہٹ کے سڑیں

گھاس کھودے یہاں کی ترکاری

امراض و نقاہت کا حال

یہاں بیماریاں دیکھیں زیادہ ساری دنیا سے

بنا ہے کیسۂ امراض گویا جسمِ انسانی

تمامی عمر کا سرمایۂ طاقت لٹاتا ہے

جو بھولے سے کوئی کر بیٹھتا ہے تپ کی مہمانی

دوا کا قحط ہے' امراض بے مانگے میسر ہیں
گرانی ہوشیاری کی ہے' بے ہوشی کی ارزانی

خبر بھی آنہیں سکتی شفا کی اس جزیرے میں
کیا ہے امتِ عیسیٰ نے کیا اسکو بھی زندانی

اجل جس دن سے غوطہ کھا کے پہنچی اس جزیرے میں
نکلتی ہی نہیں ایسی ڈری ہے دیکھ کر پانی

کریں کیا مُردوں کی خدمت کہ ہیں بے دست وپا زندے
بتاؤ ہاتھ کس سے مانگیں بہرِ فاتحہ خوانی

رباعیات

طالع کی کمال نارسائی ٹھہری
خارش کی بدن سے آشنائی ٹھہری
ان دونوں میں صلح سخت مشکل ہے منیر
ناخن کی گوشت سے لڑائی ٹھہری

○

تحریرِ کچہری سے تو پنجہ سُن ہے
کھجلائیں گے خارش کو برابر دُھن ہے
کیونکر لکھنے میں جسم کھجلاؤں منیر
افسوس' انگشتِ خامہ بے ناخُن ہے

○

مرتا ہوں مصائب کی فراوانی سے
صدمے ہیں رنجِ جسمی و جانی سے
افسوس ہے اس مریض کی حالت پر
جو دور ہے طبیبِ روحانی سے

ہر چند کہ زنداں میں جگر جلتا ہے
پر چھوڑ کے ضعف کب ہمیں ٹلتا ہے
اٹھتے ہیں عصا کے زور سے پاؤں منیر
ٹٹو، لاٹھی کے خوف سے چلتا ہے

لوازمات زندگی کا فقدان

اگر اشیاء میسر ہیں تو خود محتاج ہیں قیدی
بڑی قسمت جو روٹی دال مل جائے بآسانی
ابالی دال کو کتے کی قے فاقہ سمجھتا ہے
نکمے چاولوں کو جانتا ہے بھینس کی سانی
میسر لحمِ مرغِ دل ہے لیکن گوشت عنقا ہے
چبائیں کیوں نہ پشتِ دست اس ٹاپو کے زندانی
سوائے لختِ دل ممکن نہیں ہے عیدِ اضحیٰ کو
اگر گاوِ زمیں، ثورِ فلک کی بھی ہو قربانی
اگرچہ گندمی رنگوں کو پیسا اس جزیرے نے
نہ پائی ایک دن بھی آردِ گندم کی ارزانی
سوا خارش کے دانوں سے ارہر کی دال کی کثرت
زیادہ استخواں ریزوں سے چاول کی فراوانی
لبِ شیریں کے بوسوں سے بھی بڑھ کر گڑ کی دقت ہے
نہ پائیں صورتِ فرہاد اگر سر پھوڑیں زندانی
شکر کے بدلے ریگِ ساحلِ دریا ہزاروں من
کرے کیا خاک کوئی دعوتِ مورِ سلیمانی

○

دال چاول سے کہہ دو رخصت ہوں
پانی میں ڈوبے یہ نمک کھاری

رباعیات

جس نے مری پینے کی سنک تاڑی ہے
کہتا ہے کہ جنگل کی جلی جھاڑی ہے
کپڑا نہیں اور پیچ باقی ہیں، منیر
گویا ناگن نے کیچلی جھاڑی ہے

○

پامال ہوں زمانے کی چالوں سے
کیا ملے سفید پیرہن والوں سے
بوسیدہ ہوئی ہیں لنگیاں جب سے منیر
پھرتی ہے برہنگی پھٹے حالوں سے

○

چشمِ سوزن ہے اشکبار ان روزوں
جامۂ صبر تار تار ان روزوں
زنجیر کے ٹانکے توڑ کر ہائے منیر
سیتے ہیں پائجامۂ یار ان روزوں

○

دل آتشِ مطبخ سے جلانا ٹھہرا
غم کھانے سے بھی سوا کھانا ٹھہرا
کیونکہ طمعِ خام کی پھر دال گلے
اپنے ہاتھوں سے جب پکانا ٹھہرا

ہر چند کہ ہم دل کے کڑے ہوتے ہیں
جاڑے کے مگر صدمے بڑے ہوتے ہیں
سردی کا خوف دیکھو عریانی میں
کمل کے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں

○

ہر خارِ سرِ رہ کو نہ نشتر سمجھو
پھرتے ہو جو ننگے پاؤں بہتر سمجھو
نالش نہ کرو برہنہ پائی کی منیر
ہر آبلہ موزے کے برابر سمجھو

○

لذت کی زبان سے جدائی ٹھہری
روکھے کھانے سے آشنائی ٹھہری
گھی کی صورت نظر نہیں آتی منیر
شیرِ کنجشک کی ملائی ٹھہری

○

تمباکو بھی ہوا ہے کڑوا ہم سے
رک رک کر بولتا ہے حقّا ہم سے
برسات میں کس غضب کی گرمی ہے منیر
جھلوانے لگی آگ بھی پنکھا ہم سے

○

زنداں میں تو ہم اسیر و مجہول آئے
کس طور سے نیند حسبِ معمول آئے
گھر سے نکلے جو بے حواسی میں منیر
خواب راحت پلنگ پر بھول آئے

ہیں ضعف سے ہڈیاں عیاں سر تا پا
سونے سے زمین کے بہت ہے ایذا
اکسیر ہے فرشِ خوابِ زنداں میں منیر
سونا ہے پلنگ کا نصیبِ اعدا

○

زنداں میں جو بڑھ چلنے کے آہنگ ہوئے
کپڑے بھی ہم سے عازمِ جنگ ہوئے
ملبوسِ خلافِ وضع کے شکوے میں
کچھ عرض کیا تو پائنچے تنگ ہوئے

یہ ہے منیر شکوہ آبادی کی حبسیہ شاعری اور اس کے موضوعات کا ایک اجمالی تعارف۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں تخلیق کی جانے والی زندانی شاعری میں ذاتی درد و غم کا بیان زیادہ ہے۔ وہ ملی اور قومی جذبہ جو ہمیں بعد کے زمانہ میں مولانا محمد علی جوہر' مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کے حبسیہ کلام میں ملتا ہے اس سے واجد علی شاہ اختر' بہادر شاہ ظفر اور منیر شکوہ آبادی کا کلام بڑی حد تک خالی نظر آتا ہے۔ دراصل اس وقت تک ملک کی آزادی کا وہ تصور ہی موجود نہ تھا جو انیسویں صدی کے آخری برسوں اور بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں ابھرنے والی سیاسی تحریکات کے نتیجہ میں پروان چڑھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء یقیناً" غیر ملکی سامراج کو اکھاڑ پھینکنے کی ایک بھرپور کوشش تھی مگر اس کوشش کے پیچھے کوئی منظم منصوبہ نہ تھا' چنانچہ اس تحریک کی ناکامی کی صورت میں قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کرنے والے شعراء کے کلام میں سیاسی شعور کا فقدان دکھائی دیتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے سانحہ کے نتیجہ میں جو زندانی شاعری سامنے آئی ان میں منیر کے علاوہ واجد علی شاہ اختر اور بہادر شاہ ظفر کے نام سرفہرست ہیں۔ ان تینوں شعراء میں واجد علی شاہ کو تو اپنی ذاتی محرومیوں کے علاوہ کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ ان کے مقابلہ میں بہادر شاہ ظفر اور منیر نے کسی حد تک اپنے دکھ درد کے پہلو بہ پہلو عام لوگوں کے

غموں کو بھی اپنی زندانی شاعری میں جگہ دینے کی کوشش کی ہے۔ منیر کی بعض غزلیں اور ان کے قصیدہ "فریاد زندانی" کے وہ اشعار جن میں انہوں نے مرحوم لکھنؤ کا ماتم کیا ہے کسی طرح بھی شہر آشوب سے کم نہیں ہیں۔

حبسیہ شاعری کے نقطۂ نظر سے ایک اور امتیاز جو منیر کو اپنے ہم عصر زندانی شعراء پر حاصل ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے مقابلتاً" زیادہ اصناف شعری کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ حبسیہ شاعری کے سلسلہ میں واجد علی شاہ کا قابل ذکر کارنامہ صرف ان کی مثنوی "حزن اختر" ہے۔ بہادر شاہ کا حبسیہ کلام بھی بیشتر غزلیات کی صورت میں ہے جبکہ منیر نے قصائد' قطعات' رباعیات اور غزل تمام اصناف سے حسب ضرورت اپنے تجربات واحساسات کی ترجمانی کا کام لیا ہے۔

شاعری کو نقادان ادب عموماً" دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں یعنی داخلی (Subjective) اور خارجی (Objective) داخلی یا موضوعی شاعری میں شاعر اپنی ذات میں گم ہو کر شعر کہتا ہے اور اپنے ذاتی تجربات واحساسات کو اپنے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ خارجی یا معروضی شاعری میں اپنی ذات سے ہٹ کر وہ کائنات اور گردوپیش پر نظر ڈالتا ہے۔ یہ تقسیم محض افہام وتفہیم کے لئے کی گئی ہے کیونکہ خالصتاً" داخلی یا خارجی شاعری قسم کی کوئی چیز موجود نہیں۔ شاعر گردوپیش کی تصویر کشی کرتے کرتے کبھی اپنی ذات کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے اور کبھی اپنے ذاتی تجربات واحساسات کو بیان کرتے کرتے وہ اپنی ذات کی حدود کو پھلانگ کر حیات وکائنات کا مشاہدہ شروع کر دیتا ہے۔ کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اس کی شاعری کے غالب رجحان ہی کی روشنی میں یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ اس شاعر کا کلام خارجیت یا داخلیت لئے ہوئے ہے۔

تمام اصناف شاعری میں مثنوی کی صنف کو خارجی یا معروضی شاعری کے لئے سب سے زیادہ موزوں تصور کیا جاتا ہے۔ اس خیال کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ اردو کی بعض مشہور مثنویاں سحرالبیان' گلزار نسیم' زہر عشق اور طلسم الفت وغیرہ خارجی شاعری کا بہت کامیاب نمونہ ہیں جن میں شعراء نے منظر نگاری' واقعہ نگاری اور کردار نگاری سے بھرپور کام لیا ہے۔ واجد علی شاہ کی مثنوی "حزن اختر" کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ امید بجا طور پر پیدا ہوتی ہے کہ شاعر اس مثنوی میں ہمیں زنداں کے شب و روز' وہاں کے مناظر اور نظربندی کے دوران پیش آنے والے واقعات وتجربات سے روشناس کرائے گا۔ خصوصاً" اس صورت میں جب وہ ایک ایسی صنف میں

اظہار کر رہا ہو جو اس قسم کی باتوں کے پیش کرنے کا ایک کامیاب وسیلۂ اظہار بھی ہو لیکن کلام پڑھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ یہ پہلو اس مثنوی میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ واجد علی شاہ کے دل ودماغ پر عیش ونشاط رفتہ کی یادیں اپنے تمام رنگوں کے ساتھ اس طرح منعکس رہتی ہیں کہ عشق صادق اور بوالہوسی کی حدود ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ مثنوی "حزن اختر" کی ایک تاریخی اہمیت ضرور ہے مگر وہ حبسیہ شاعری کا کوئی قابل قدر نمونہ نہیں کیونکہ نہ تو اس میں وہ شدید داخلی ردعمل موجود ہے جو کسی حساس دل ودماغ پر قیدوبند یا جلاوطنی کی صورت میں مرتب ہوتا ہے اور نہ باہر کی دنیا کی وہ تصویریں ہی نظر آتی ہیں جن سے ہم زنداں کی زندگی اور وہاں کے ابتلا کا اندازہ لگا سکیں۔

بہادر شاہ ظفر کا حبسیہ کلام بیشتر غزل کی ہیئت میں ہے۔ غزل کا داخلی پیرایۂ اظہار ان کے حقیقی جذبات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں وہ گداز و نشتریت موجود ہے جو اردو کی حبسیہ شاعری میں یقیناً" ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی بیان کی ہوئی باتیں خیالی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی آپ بیتی کو گل وبلبل کی زبان میں اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ کلام ان کے دل کے اجڑ جانے ہی کی داستان نہیں بلکہ ایک تہذیب اور ایک شہر کے مٹ جانے کا مرثیہ بھی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا حبسیہ کلام چونکہ داخلی رنگ لئے ہوئے ہے اس لئے اس میں خارجی دنیا کے مناظر یعنی حبسیہ کلام کی مناسبت سے زنداں کے شب وروز کو پیش کرنے کی گنجائش نہ تھی اور نہ اس قسم کی تصویر کشی کی ہم کو بہادر شاہ ظفر سے توقع کرنی چاہیے۔

بہادر شاہ ظفر کی داخلی حبسیہ شاعری کے مقابلہ میں منیر کا حبسیہ کلام دونوں پہلو یعنی موضوعیت اور معروضیت کا حامل ہے۔ منیر کی وہ غزلیں جو انہوں نے زنداں میں کہیں ان پر داخلیت کا رنگ غالب ہے' انہوں نے ان غزلوں میں خود پر گزرنے والے حادثات کے نتیجہ میں اپنے جذباتی ردعمل کو رمز و کنایہ کی زبان میں پیش کر دیا ہے۔ ان غزلوں میں درد کی وہ لہر نہیں ہے جو ہمیں بہادر شاہ ظفر کی غزلوں میں ملتی ہے۔ منیر کی زندگی میں حادثات غم ضرور رونما ہے مگر ان کی شدت وہ نہ تھی جو بہادر شاہ ظفر کو دیکھنا پڑی۔ ایک اور سبب منیر کی حبسیہ غزلوں میں ظفر کے مقابلہ میں نشتریت کی کمی کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ ان کے حوصلہ کو قائم رکھنے کا موجب تھا۔ اس عقیدہ کی استقامت کا اندازہ ان کے ان قصائد سے لگایا جا سکتا ہے جو

انہوں نے انڈمان ہی کی جلاوطنی کے دوران نعت اور دوسرے بزرگان کی مدح میں کہے ہیں- اسی عقیدہ کا ایک پائیدار نقش' ان کی طویل مثنوی "معراج المضامین" ہے جو انہوں نے انڈمان سے رہائی کے بعد لکھی- بہادر شاہ ظفر بھی اگرچہ سلسلۂ چشتیہ میں حضرت فخر الدینؒ کے ہاتھ پر بیعت تھے (۵۸) مگر مذہب سے ان کا یہ لگاؤ دراصل ایک رد عمل تھا اکبر شاہ ثانی کے اس فیصلہ کے خلاف جس کی رو سے انہوں نے اپنی چہیتی بیگم ممتاز محل کی خوشنودی کے لئے بہادر شاہ ظفر کے مقابلہ میں شہزادہ جہانگیر کو ولی عہد سلطنت بنانا چاہا تھا- اکبر شاہ ثانی نے یہاں تک کہہ دیا کہ ابو ظفر میرا بیٹا ہی نہیں ہے- ورنہ بہادر شاہ ظفر کا لڑکپن اور ابتدائے جوانی اس قلعہ میں بسر ہوا تھا جہاں عیش کوشی اور تلذذ کے تمام سامان مہیا تھے- صوفیاء ہی کی صحبت میں ظفر تصوف کی جاشنی سے آشنا ہوئے- جیسے جیسے ان پر مصائب کی یورش بڑھی وہ تصوف سے اور بھی قریب ہو گئے- دراصل بہادر شاہ ظفر کو تصوف میں ایک سکون ملتا تھا وہ زندگی کی تلخیوں کو تصوف میں گم کر دینا چاہتے تھے- اس جائزے سے نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ بہادر شاہ ظفر کا مذہب سے لگاؤ سلبی نوعیت کا تھا- اگر یہ تعلق ان کی ابتدائی تربیت کا نتیجہ ہوتا تو اس کی جڑیں ان کی شخصیت میں منیر کی طرح زیادہ گہری ہوتیں-

منیر کی حبسیہ شاعری کا دوسرا رخ تمام تر معروضی ہے جس میں وہ ان خارجی حالات سے روشناس کراتے ہیں جو ان کو باندہ کے قید خانے اور بعد میں انڈمان میں جلاوطنی کے طویل برسوں میں پیش آئے- منیر کی حبسیہ شاعری کے اس پہلو پر ان کے حبسیہ کلام کے تعارف کے سلسلہ میں تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے' یہاں صرف اس قدر کہنا کافی ہو گا کہ ایسی زندانی شاعری جس میں قید و بند کی حالت' جیل کی اذیتیں اور وہاں کی متحرک تصویریں موجود ہوں اردو میں منیر سے پہلے نایاب اور ان کے بعد کمیاب رہی ہے- بعد کے زمانے میں زنداں کے ماحول کی عکاسی زیادہ فن کارانہ انداز میں کسی حد تک گوپی ناتھ امن کی نظموں "جیل میں بسنت" اور "کوئل" ظہیر کاشمیری کی نظم "شب زنداں" اور فیض احمد فیض کے مجموعہ ہائے کلام "زنداں نامہ" اور "دست صبا" کی بعض نظموں میں دکھائی دیتی ہے- دور جدید ہیں اردو کی حبسیہ شاعری میں معروضیت کا انداز کیا ہے اس امر کا اندازہ فیض کی ایک "نظم زنداں کی ایک صبح" کے ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے-

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا۔ "جاگ سحر آئی ہے
جاگ اس شب جو مے خواب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تہِ جام اتر آئی ہے"
عکسِ جاناں کو ودع کرکے اٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جابجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھوں سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

صحنِ زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے
سطحِ ظلمت سے دمکتے ہوئے ابھرے کم کم
نیند کی اوس نے ان چہروں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا درد، فراقِ رخِ محبوب کا غم

دور نوبت ہوئی، پھرنے لگے بیزار قدم
زرد فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
اہلِ زنداں کے غضب ناک خروشاں نالے
جن کی باہوں میں پھرا کرتے ہیں باہیں ڈالے
لذتِ خواب سے مخمور ہوائیں جاگیں
جیل کی زہر بھری چور صدائیں جاگیں۔
دور دروازہ کھلا کوئی، کوئی بند ہُوا
دور مچلی کوئی زنجیر، مچل کے روئی
دور اترا کسی تالے کے جگر میں خنجر

سر پٹکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی

گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمنِ جاں (۵۹)

ان اشعار میں خالص معروضیت موجود ہے مگر شاعر کے احساس جمال نے ان شعروں میں ایک خاص دلکشی بھر دی ہے۔ یوں یہ شعر زنداں کے ماحول کے عکاس ہوتے ہوئے بھی اپنے جمالیاتی پیرایۂ اظہار کی بدولت خود میں ایک ابدی حسن سموئے ہوئے ہیں۔ منیر نے اردو کی حبسیہ شاعری میں جس معروضی پیرایہ اظہار کی بنیاد رکھی' جدید دور کے حبسیہ نگار شعراء کے یہاں یہ اسلوب زیادہ نکھرا نکھرا دکھائی دیتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ منیر سے ظہیر کاشمیری اور فیض احمد فیض تک اردو کی حبسیہ شاعری کا ارتقائی سفر سو برس سے زیادہ مدت پر محیط ہے۔ اردو کی حبسیہ شاعری میں منیر شکوہ آبادی ایک منفرد اور بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہ اردو میں معروضی حبسیہ شاعری کے نہ صرف موسس ہیں بلکہ اس خاص انداز کی اتنی بھرپور حبسیہ شاعری ان کے بعد آج تک کسی شاعر نے نہیں کی۔

حوالہ جات و حواشی

حیات

(۱) افسر صدیقی امروہوی کے مضمون "نقش و نگارِ دبیر" (مطبوعہ رسالہ سہ ماہی "اردو" کراچی، شمارہ نمبر۳، ۱۹۷۵ء- ص ۹۳) سے بہ سبب سہو کتابت یہ مترشح ہوتا ہے کہ جیسے انکا وطن شکوہ آباد نہیں بلکہ "شاہ آباد" (سہوِ کتابت) تھا حالانکہ شاہ آباد نام کا کوئی قصبہ ضلع مین پوری میں نہیں- البتہ اس نام کے قصبات ضلع پٹنہ، ضلع ہردوئی، انبالہ (پنجاب) اور ریاست رام پور میں ہیں (چیمبرز گزیٹیر آف دی ورلڈ) ایڈیشن ۱۹۲۳ء- ص ۶۲۷- مطبوعہ اے ایف چیمبرز لمیٹڈ (لندن)

(۲) ہنٹر، ڈبلیو، ڈبلیو- امپیریل گزیٹیر آف انڈیا، جلد پنجم (لندن ۱۹۰۸ء) ص ۲۲۳

(۳) منیر شکوہ آبادی، سید اسمٰعیل حسین- "منتخب العالم" (دیوان اول) مطبوعہ مطبع سعیدی رام پور (۱۳۲۳ھ) ص ۲۹۹

(۴) فضل حسین اٹاوی- "منیر شکوہ آبادی" مطبوعہ "مخزن" لاہور، جون (۱۹۰۳ء) ص ۳۴- نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور نے شاوکی موزونیِ طبع کی تعریف کی ہے اور ان کے کلام کو دلچسپ قرار دیا ہے- (تذکرۂ سرور "عمدہ منتخبہ" مطبوعہ دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۱ء- ص ۳۸۷)

(۵) شیفتہ، نواب مصطفیٰ خاں- "گلشن بے خار" (۱۲۵۰ھ) ترجمہ احسان الحق فاروقی- اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی (۱۹۶۳ء) ص- ۲۶۶

(۶) تاثیر اٹاوی، لالہ مادھورام- "منیر شکوہ آبادی" مطبوعہ "اردوئے معلیٰ" علی گڈھ، فروری ۱۹۰۵ء- ص ۳۰

(۷) "منتخب العالم" (دیوان اول) مطبوعہ رام پور- ص ۲۹۹

(۸) "منتخب العالم" (دیوان اول) مطبوعہ رام پور- ص ۲۹۹

(۹) محسن لکھنوی، سید محمد- تذکرہ "سرا پا سخن" مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ (۱۲۷۷ھ) ص ۲۸۶- ص ۳۷۱

(۱۰) منیر شکوہ آبادی، میراسمٰعیل حسین- "مثنوی معراج المضامین" مطبوعہ گلشن باقری لکھنؤ (۱۳۱۲ھ) ص ۲۰

(۱۱) منیر شکوہ آبادی، سید اسمٰعیل حسین- "تنویر الاشعار" (دیوان دوم) مطبوعہ مطبع سعیدی رام پور (۱۳۲۵ھ) ص ۲۲۹

(۱۲) "تنویر الاشعار" (دیوان دوم) مطبوعہ رام پور- ص ۲۳۹

(۱۳) منیر شکوہ آبادی، سید اسمٰعیل حسین- "کلیات منیر" مطبوعہ نامی گرامی ثمر ہند لکھنؤ (۱۲۹۶ھ) ص ۵۱۶- ۵۱۷

(۱۴) کلیات منیر- ص ۵۹

(۱۵) منیر شکوہ آبادی، سید اسمٰعیل حسین- "نظم منیر" (دیوان سوم) مطبوعہ مطبع سعیدی رام پور (س ن) ص ۵۰۲

(۱۶) محمد طفیل- مجلہ "نقوش" لاہور (مکاتیب نمبر، جلد دوم) شمارہ ۶۶ (نومبر ۱۹۵۷ء) ص ۴۹۸- مدیرِ رسالہ سے اس مکتوب کی تاریخ درج کرنے میں سہو ہوا ہے کیونکہ منیر کا انتقال اس تاریخ سے تین ماہ پیشتر ہو چکا تھا (راقم)

(۱۷) کلیات منیر- ص ۹۲

(۱۸) بدر، حسن افضل- "منشی منیر شکوہ آبادی" مطبوعہ رسالہ "اردوئے معلیٰ" علی گڈھ- اپریل ۱۹۰۵ء- ص ۲۸

(۱۹) یار علی جان، میر- "مسدس تہنیتِ جشنِ بے نظیر" مرتبہ محمد علی خاں اثر رام پوری، مطبوعہ اسٹیٹ پریس رام پور (۱۹۵۰ء) ص ۴۶- بظاہر اس امر پر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے شاعر (منیر) کے فرزند (ابو محمد بدر) کے ذکر سے جو خود بھی شاعر تھے اس عہد کے تذکرے خالی ہیں- بدر، نو دس برس کی عمر میں منیر کے ساتھ رام پور آگئے تھے اور یہیں ۳۲ سال کی عمر میں (۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء) ان کا انتقال ہوا- شعرائے رام پور کے سلسلہ میں امیرمینائی کا تذکرہ ("انتخاب یاد گار" مرتبہ ۱۲۹۰ھ) ایک بنیادی ماخذ ہے مگر یہ بھی بدر کے ذکر سے خالی ہے- بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ جس وقت امیرمینائی نے یہ تذکرہ مکمل کیا، بدر کی عمر صرف سترہ برس تھی- قرینِ قیاس یہی ہے کہ اس وقت تک بدر نے شعر گوئی اختیار ہی نہیں کی تھی (راقم)

(۲۰) ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر- "دبستان دبیر" مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ (بار اول ۱۹۶۶ء) ص ۲۴۶

(۲۱) کلیات منیر- (منتخب العالم، دیوان اول) ص- ۳۱۱

(۲۲) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر- شبابی اکبر آبادی، مفتی محمد انتظام اللہ و عبدالسلام، مولانا- "لکھنؤ کی آخری شمع" مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ (س ن) ص ۷۷

(۲۳) قادری، حامد حسن- "آگرہ کا قدیم فارسی مشاعرہ" - مشمولہ "نقد و نظر" مطبوعہ شاہ اینڈ کمپنی آگرہ (۱۹۴۲ء)- ص ۱۸۶

(۲۴) فضل، حسین اٹاوی- "منیر شکوہ آبادی"- ص ۳۵

(۲۵) والا جاہ میر علی اوسط رشک ایک خوش فکر اور خوش گو شاعر تھے- رشک کا تعلق لکھنؤ سے تھا لیکن ان کا بیشتر قیام کان پور میں رہا- ان کے والد کا نام میرسلیمان تھا، رشک، ناسخ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں- بقول انصار اللہ نظر،

ناسخ نے ان کو چند برس اصلاح دے کر اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ خود دوسروں کے کلام کی اصلاح کر سکیں- ۱۲۶۵ھ میں ان کے پوتے کا انتقال ہوا جس سے دل برداشتہ ہو کر وہ ۱۲۶۷ھ میں کربلائے معلیٰ چلے گئے' وہیں ان کا انتقال ۱۲۸۴ھ میں ہوا- تحقیقِ لفظی کے ساتھ زبان کی سلاست و روانی ان کے کلام کی ایک نمایاں صفت ہے- اپنے استاد کی خدمات زبان کو منیر نے ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

آبداری پائی نطقِ رشک کے باعث' منیر
ہار سچے موتیوں کا نظمِ اردو ہوگئی
(کلیات منیر- ص ۲۵۴)

رشک کے تین دیوان اور ایک لغت ہے جس کا نام "نفس اللغتہ" ہے-

(۲۶) کلیات منیر (دیباچہ فارسی' دیوان اول و دوم) ص- ۳

(۲۷) کلیات منیر (دیوان اول' منتخب العالم) ص- ۶۵

(۲۸) مثنوی "معراج المضامین"- ص ۷

(۲۹) کلیات منیر (فارسی دیباچہ- دیوان اول و دوم) ص ۳

(۳۰) یہ قطعہ 'منیر کے دیوان اول "منتخب العالم" میں شامل ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے:

پیشِ نظر ہے سیرِ گلستانِ لکھنؤ
ہر ایک سمت نور کا جلوہ ہے دیکھ لو

اور جس آخری شعر سے تاریخ نکالی گئی ہے' وہ یہ ہے:

تاریخ میرے آنے کی ہاتف نے یوں کہی
زندہ منیر خلد میں پہونچا ہے دیکھ لو
(منتخب العالم' (دیوان اول)' مطبوعہ رام پور ص ۳۰۱- ۳۰۲)

(۳۱) کلیات منیر (فارسی دیباچہ' دیوان اول و دوم) ص ۳

(۳۲) ظفر الدولہ معتبر الملک رفیع الامراء نواب علی اصغر خاں بہادر ناصر جنگ وزیر ابو ظفر بہادر شاہ جنت آرامگاہ' مولوی علی اکبر کے فرزند اور خواجہ حیدر علی آتش کے تلامذہ میں سے تھے- آپ سے نواب ظہیر الدولہ غلام یحییٰ خان کی دختر منسوب تھیں جو محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے وزیر تھے- نواب علی اصغر خان کا مولد کشمیر تھا' مگر ان کے آباء لکھنؤ ہی میں آباد تھے- کلکتہ میں ان کا ایک مدت تک قیام رہا- نواب علی اصغر خان اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے- ۱۲۷۶ھ میں انتقال ہوا' تاریخ وفات: "آہ درد و ہائے غم" سے برآمد ہوتی ہے- انہوں نے اپنی یادگار ایک مثنوی اور ایک دیوان چھوڑا- اردو نمونہ کلام یہ ہے:

بتا نہ کوچۂ گیسو میں ہے نہ پہلو میں
تمہی بتاؤ مجھے پھر کہاں ہے دل میرا

نہیں دیر و حرم سے کام ہم الفت کے بندے ہیں
وہی کعبہ ہے اپنا' آرزو دل کی جہاں نکلے

(علی حسن خاں' سید- "تذکرہ بزم سخن" مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ (۱۲۹۸ھ) ص ۱۴-ونساخ' عبدالغفور- "تذکرہ سخنِ شعراء" مرتبہ عطا کاکوی' مطبوعہ آرٹ پریس پٹنہ (مئی ۱۹۷۲ء) ص ۱۷)

(۳۳) منیر نے "رقص و عیش کا جلسہ" کہا ہے مگر لکھنؤ والے "رقص و سرود کی محفل" کہتے ہیں- ہو سکتا ہے کہ یہ ترکیب ضرورتِ شعری کے تحت مجبوراً استعمال کی گئی ہو- (راقم)

(۳۴) اہلِ لکھنؤ بجائے "تعزیہ خانہ" "امام باڑہ" کہتے ہیں (راقم)

(۳۵) ڈاک پالکی کے ذریعہ بھیجی جاتی تھی جس کو کہار کندھوں پر اٹھا کر چلتے تھے- دو کہار پالکی کے آگے اور دو کہار پیچھے ہوتے تھے- چاروں کہار پانچ یا چھ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد تبدیل ہو جاتے تھے اور ان کی جگہ تازہ دم نئے کہار لے لیتے تھے- گویا ہر پالکی کے ساتھ کہاروں کی تعداد آٹھ ہوتی تھی- ڈاک کی رفتار چار میل فی گھنٹے سے زیادہ نہ تھی-

(Meer Hassan Ali, Mrs. "Observation on the Muslimans of India" Oxford, London, 1978-P-170)

(۳۶) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۵۳۶

(۳۷) منشی احمد حسن خاں نام' عروج تخلص۔ والد کا نام منشی محمد حسن خاں تھا۔ جو قصبہ آسیون ضلع لکھنؤ (☆) کے شیوخ سے تھے۔ عروج فرخ آباد میں پیدا ہوئے' دہلی اور لکھنؤ میں بہت رہے۔ اکتسابِ علوم و فنون میں خوب محنت کی۔ آخر میں کان پور میں بودو باش اختیار کر لی تھی۔ ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء میں نواب کلب علی خاں والئی رام پور کی قدردانی انہیں رام پور کھینچ لائی۔ یہاں ان کی تنخواہ سو روپے تھی۔ عربی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ فارسی میں گویا استادِ کامل تھے۔ خوش نویسی نستعلیق میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ اور میر علی اوسط رشک سے اردو کلام میں استفادہ کیا تھا۔ اسی تعلق سے ان کی دوستی منیر سے استوار ہوئی۔ عروج نہایت مہذب' باوضع اور دوست دار آدمی تھے۔ رام پور میں پہلے رجسٹری کی خدمت آپ کے سپرد ہوئی' بعد میں نواب کے مصاحبین میں شامل ہوگئے۔ رام پور آنے سے پہلے وہ انگریز کی ملازمت میں رہ چکے تھے' چنانچہ دہلی کی ریزیڈنسی میں ملازم تھے' پھر فرخ آباد میں صاحب ایجنٹ گورنر جنرل بہادر مختار الملک سرکار دولت مدار یعنی انگریز کے پاس ملازم رہے۔ رام پور سے علیل ہو کر کان پور گئے' اور وہیں ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء میں انتقال ہوا۔

(تذکرہ "کاملانِ رام پور" مولفہ حافظ احمد علی خان شوق' مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی۔ مارچ ۱۹۲۹ء۔ ص ۱۱)

(☆) آسیون ضلع اناؤ میں ہے نہ کہ ضلع لکھنؤ میں۔ یہ قصبہ اناؤ سے بیس میل شمال میں اس سڑک پر واقع ہے جو لکھنؤ سے بانگرمیو جاتی ہے۔ ۱۸۶۹ء کی مردم شماری کے مطابق اس قصبہ کی آبادی ۵۸۱۷ نفوس پر مشتمل تھی۔

(Imperial Gazetteer of India '(Vol:I) by W.W. Hunter- London -(1818)- P 238)

(۳۸) نواب یوسف علی خان'نواب محمد سعید خاں کے فرزند تھے جو ۱۲۷۱ھ میں والد کی وفات کے بعد تخت نشین حکومت ہوئے۔ نواب یوسف علی خاں بڑے علم دوست' ہنر پرور اور شعراء کے مربی تھے۔ خود بھی شاعر تھے اور ناظم تخلص کرتے تھے۔ ناظم کا دیوان ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ ابتداء میں مومن خان مومن سے اصلاح لیتے تھے' بعد میں مرزا غالب اور پھر مظفر علی اسیر کو کلام دکھانے لگے۔ غالب ہی کے مشورہ سے انہوں نے ناظم تخلص اختیار کیا تھا۔ غالب اور اسیر کے علاوہ فضل حق خیر آبادی اور میر حسین تسکین بھی ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کے اجڑ جانے کے بعد وہاں کے شاعروں کو ان ہی کے سایۂ عاطفت میں پناہ ملی اور یوں ایک نئے طرزِ سخن کی بنیاد پڑی۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے دور کا اہم واقعہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہے جس سے معاشرتی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ نواب یوسف علی خاں نے اپنے تدبر اور حسنِ انتظام سے اپنے علاقے پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ انگریز حاکم ان کے عمل سے بہت خوش تھے' چنانچہ ان کو فرزندِ دل پذیرِ دولت انگلشیہ اور سٹار آف انڈیا کے خطابات دیئے گئے۔ ۲۴ ماہ ذیقعدہ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۰ اپریل ۱۸۶۵ء کو انتقال کیا۔

ناظم کا نمونہ کلام یہ ہے:

اس کے در پر جو مجھ کو بار ہوا — اپنے صدقے ہزار بار ہوا
نالے کا عذر' ناگوار ہوا — میں ہی الٹا گناہ گار ہوا
تو کسی کا ہو دوست' میں ناحق — دشمنِ اہلِ روزگار ہوا
تیر واں شست سے چھٹا ہی نہیں — یاں یہ کیا ہے کہ دل کے پار ہوا
شرم پھر مانعِ وصال ہوئی — شکوے سے جب وہ شرمسار ہوا

اس میں وہ کیا کرشمہ ہے ناظم
جس سے تو پھر ابیوار ہوا

("تاریخ بدیع" مصنفہ منشی امیر اللہ تسلیم' مطبوعہ مطبع افتخار العالم رام پور (۱۳۱۲ھ) ص ۸۸۔ ۸۹۔ "تاریخ ادب اردو" مصنفہ رام بابو سکسینہ مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ (بارسوم) ص ۳۵۳۔ دیوان ناظم' مطبع حسنی محمد خاں رام پور (۱۲۷۸ھ) ص ۲۰۶)

(۳۹) کلیات منیر (منتخب العالم' دیوان اول) ص ۱۳۳۔ ۱۳۴

(۴۰) نواب اسد الدولہ' سید محمد ذکی بن مرزا محمد علی خاں حیدر نیشاپوری۔ پہلے سرفراز علی قادر پھر علی اوسط رشک اور بعد میں منیر شکوہ آبادی کی شاگردی قبول کی۔ (راقم)

(۴۱) کلیات منیر (منتخب العالم' دیوان اول) ص ۲۴۶ ۔"کنپو" کان پور کا مروجہ نام تھا' اب کانپور کہتے ہیں ۔

(۴۲) کلیات منیر (منتخب العالم' دیوان اول) ص ۲۷۱

(۴۳) نصیرالدولہ معین الملک حشمت جنگ نواب تجمل حسین خاں کے مورثِ اعلیٰ نواب محمد خاں بنگش تھے جنھوں نے سلطنتِ مغلیہ کے دورِ آخر میں فرخ آباد کی ریاست قائم کی تھی بلکہ فرخ آباد کے نام کا قصبہ بھی انہوں نے ہی فرخ سیر کے نام پر آباد کیا تھا۔ نواب تجمل حسین' نواب خادم حسین خان شوکت جنگ بن امداد حسین خاں ناصر جنگ کے فرزند تھے۔ تجمل حسین خان ممتاز محل کے بطن سے ماہ جمادی الثانی ۱۲۳۸ھ مطابق فروری ۱۸۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ نواب موصوف اہلِ علم کے قدر دان تھے۔ علماء و شعراء کی محفل ان کے یہاں ہوتی تھی چنانچہ منیر شکوہ آبادی کو بھی انہوں نے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ نواب تجمل حسین خاں خود بھی شعر کہتے تھے' ظفر ان کا تخلص تھا۔ نمونہ کلام یہ ہے :

اشک سے تر مرا گریباں ہے سلکِ گوہر مرا گریباں ہے
سینہ خاور ہے آفتاب ہے داغ صبحِ محشر مرا گریباں ہے
رہنے دے چاک چاک اے ناصح یونہی بہتر مرا گریباں ہے
عطر وال اس نے پیرہن میں ملا یاں معطر مرا گریباں ہے
قیس کے پیرہن کا جو تھا حال اس سے بدتر مرا گریباں ہے
طوقِ گردن ہے ناتوانی سے بار مجھ پر مرا گریباں ہے
دھجیاں اس کی مت اڑانا دیکھ بادِ صرصر مرا گریباں ہے
ہجر میں اے ظفر گلے پہ مرے مثلِ خنجر مرا گریباں ہے

نواب تجمل حسین خاں نے ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء کو انتقال کیا۔

("غالب" مصنفہ غلام رسول مہر' مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس لاہور (۱۹۳۶ء) ص ۹۵۔ کلیات منیر (دیوان اول' منتخب العالم) ص ۲۹۵

(۴۴) کلیات منیر (دیوان اول' منتخب العالم) ص ۳۱۴

(۴۵) کلیات منیر (دیوان اول' منتخب العالم) ص۱۲۷

(۴۶) کلیات منیر (دیوان اول' منتخب العالم) ص ۲۵۲

(۴۷) نواب تجمل حسین خاں کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے ان کی وفات کے بعد ان کے چچا زاد بھائی نواب تفضل حسین خاں فرخ آباد کے رئیس بنے۔ یہ نواب عنایت حسین خاں نصرت جنگ کے فرزند تھے جو نواب شوکت جنگ کے چھوٹے بھائی تھے۔ نواب تفضل حسین خان سلطان عالیہ بیگم کے بطن سے ماہ ربیع الآخر ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۶ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو تولد ہوئے۔ ان میں پہلے نواب تجمل حسین خاں کی سی داد و دہش نہ تھی مگر جری اور بہادر ضرور تھے۔ نواب تفضل حسین خاں نے فروری ۱۸۵۰ء میں حکومت انگلشیہ سے ہزہائی نیس کا خطاب حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تیرہ برس تک حکومت کی مگر انگریزوں کی ریشہ دوانیاں موجود تھیں۔ ۱۸۵۷ء میں جب جنگِ آزادی کا شعلہ بھڑکا تو ان کا علاقہ بھی اس کی زد میں آگیا۔ سیتا پور سے آغا حسین کمانڈر ان چیف مجاہدین دو ہزار کی فوج لے کر ان کے علاقے کی طرف آگئے' نواب نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ آغا حسین نے قرب و جوار کے علاقوں کو تاراج کیا۔ تفضل حسین خاں کا سات ماہ تک اس علاقہ پر تسلط رہا۔ اسی دوران مجاہدین کے دو سرداروں نے جن کے نام احمد یار خان اور محسن علی کاظم تھے اور جو بڑے جری تھے' قصبات سے جبریہ مال گذاری وصول کرنا شروع کردی مگر نواب کی اطاعت سے منہ نہ پھیرا۔ ادھر بہادر شاہ ظفر کا دہلی سے شقہ پہنچا کہ نواب تفضل حسین خاں کو نائب السلطنت تسلیم کر لیاگیا ہے۔ نواب نے مجاہدین سے یہ معاملہ طے کیا کہ جس نے انگریزوں کو اس علاقے سے نکالا ہے وہ ہمارے لئے قابلِ احترام ہے اور ہماری رعایا بھی ان کی قدر و منزلت کرے گی اور ان کا ساتھ دے گی۔ چنانچہ فوج نے یہ اعلان کیا کہ گائے تمام علاقے میں ذبح نہ کی جائے۔ ۱۸۵۹ء (۱۲۷۵ھ) میں جبکہ انگریزوں کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی تھی' نواب نے میجر بیرو (Barrow) کی یقین دہانی پر خود کو انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ نواب تفضل حسین خان پر دو مقدمے چلائے گئے' ایک بغاوت کا اور دوسرا قتل کا۔ عدالت نے ان کے خلاف فیصلہ دیا اور پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ مقدمہ کے دوران نواب تفضل حسین خاں نے میجر

ہیرو کو ان کا وعدہ یاد دلایا کہ اگر تم قتل میں ذاتی طور پر شریک نہیں تھے تو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ میجر ہیرو ان دنوں اسپیشل کمشنر تھے جن کے ذمہ باغیوں کے مقدمات کی سماعت تھی۔ انگریز حکومت نے اس وعدہ اور یقین دہانی کو کوئی اہمیت نہیں دی، جس کے بعد گورنر جنرل کے یہاں اپیل ہوئی۔ اپیل میں موت کی سزا ختم ہوگئی مگر ان کو حکم دیا گیا کہ وہ برطانیہ کی حدود سے ہمیشہ کے لئے باہر نکل جائیں۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے ان کو ایک جہاز پر سوار کرکے ۱۸۵۹ء (۱۲۷۵ھ) میں عدن بھجوا دیا۔ اس موقع پر غالب نے مرزا علاؤ الدین خاں علائی کو ایک خط میں لکھا:

"مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر عموماً" اور رئیس فرخ آباد پر خصوصاً" کہ جہاز سے اتر کر سرزمین عرب میں چھوڑ دیا، اہا ہا ہا

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(غالب: "اردوئے معلیٰ" مطبوعہ، اکمل المطابع دہلی ۱۲۸۵ھ۔ ص ۴۱۱)

اس کے ساتھ ہی نواب کو خبردار کر دیا کہ اگر انہوں نے دوبارہ ہندوستان کے ساحل پر قدم رکھا تو موت کی سزا دے دی جائے گی۔ نواب تفضل حسین خاں نے مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کی جہاں اس مجاہد کا ۱۸۸۴ء (۱۳۰۱ھ) میں انتقال ہوا۔
(Qazetteer of Farrrukhabad -P -170)

(۴۸) نواب علی بہادر، نواب ذوالفقار علی خاں کے فرزند اور نواب شمشیر علی خاں، موسس ریاست باندا کے بھتیجے تھے۔ نوابین باندا میں آپ تیسرے درجہ پر آتے ہیں۔ اپنے والد نواب ذوالفقار علی خاں کی وفات (رمضان ۱۲۶۵ھ مطابق اگست ۱۸۴۹ء) کے بعد مسند نشینِ سلطنت ہوئے۔ نواب علی بہادر ایک جری اور دلیرانسان تھے۔ خود بھی شاعر تھے اور شعر و ادب کے بڑے قدر دان تھے۔ انہوں نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے موقع پر ابتدا" تیں چالیس انگریز حکام کی جانیں بچائیں لیکن آخر کار وہ "باغی" فوج کا ساتھ دینے پر مجبور ہوگئے۔ جب جنگِ آزادی کا ہنگامہ ختم ہوا اور انگریزوں نے دوبارہ اقتدار سنبھالا تو انہوں نے ان کا علاقہ اور پنشن سابقہ ضبط کرکے چھتیس ہزار روپے سالانہ وظیفہ دے کر ان کو اندور کے قلعہ میں نظر بند کر دیا (خم خانۂ جاوید، جلد سوم، ص ۲۰۱۔ ۲۰۳)۔ اس موقع پر مرزا غالب نے جن کا اس ریاست سے قریبی تعلق تھا، ایک غزل کہی جس میں علی بہادر کو دیکھنے کی آرزو موجود ہے۔ غالب کو خدشہ تھا کہ کہیں انگریز نواب علی بہادر کو جرمِ بغاوت میں پھانسی یا سزائے عبور دریائے شور نہ دے دیں۔ غالب کہتے ہیں:

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

(دیوان غالب اردو، مرتبہ امتیاز علی عرشی۔ مطبوعہ انجمن ترقیٔ اردو ہند علی گڑھ، ص ۱۹۰)

علی بہادر کا انتقال ۱۲۹۰ھ میں، اندور ہی میں ہوا۔ نواب علی بہادر، منیر کے مربی ہی نہ تھے بلکہ ان کے شاگرد بھی تھے۔ منیر کو اپنے قلبی تعلق کے سبب ان کے مرنے کا شدید صدمہ ہوا، جس کا اظہار اس قطعہ تاریخ رحلت سے ہوتا ہے جو انہوں نے اس سانحہ پر نظم کیا:

نواب علی بہادر اے بحرِ کرم — یوسف طلعت، شجاعِ یکتا، ہے ہے
اے قدر شناس و ناز بردارِ منیر — اے اہلِ سخن کے عزت افزا، ہے ہے
اے صدر نشینِ خلق و اقبال و شکوہ — اے بزمِ کرم میں مسند آرا، ہے ہے
اٹھ جائے تو جوان زمانہ سے ہائے — صد حیف افسوس و دریغا، ہے ہے
تاریخ تری یہ روکے کہتا ہے منیر — فیاضِ زماں، امیرِ زیبا، ہے ہے

(کلیات منیر، دیوان سوم، نظم منیر۔ ص ۵۳۵)

(۴۹) کلیات منیر (دیوان دوم، تنویر الاشعار) ص ۵۱۶۔ ۵۱۷

(۵۰) باندہ' جھانسی کمشنری کا ضلع ہے اس کمشنری میں تقسیم ملک سے پہلے جھانسی' باندہ' جالون اور ہمیرپور کے اضلاع شامل تھے۔ اس علاقہ کو بندیل کھنڈ بھی کہا جاتا ہے۔ انتزاع ریاست کے بعد باندہ ضلع کو الہ آباد ڈویژن میں شامل کر دیا گیا۔

(The Imperial Qazetteer of India-Vol : I- by W.W. Hunter - London 1881. P-359'364)

(۵۱) کلیات منیر (دیوان اول : منتخب العالم) ص ۳۲۷

(۵۲) کلیات منیر (دیوان دوم : تنویر الاشعار) ص ۶۰۰

(۵۳) اشتیاق حسین قریشی۔ " برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ" مطبوعہ کراچی یونیورسٹی (۱۹۶۷ء) ص ۲۲۵

(۵۴) محمد نجم الغنی رام پوری۔ "تاریخ اودھ"۔ حصہ پنجم۔ مطبع نول کشور لکھنؤ (۱۹۱۹ء) ص ۲۶۹

(۵۵) شیخ امان علی سحر کے والد'شیخ محمد امین کڑہ مانک پور سے' امجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ آئے۔اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ سحر' شیخ امام بخش ناسخ کے تلامذہ میں تھے جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے۔

ہو قیامت شعر میں اپنے نہ کیونکر اے سحر

مدتوں صحبت اٹھائی' ناسخِ مغفور کی

سحر' نواب محمد احسن خان کی سرکار سے منسلک تھے۔کچھ مدت امجد علی شاہ کے دربار سے بھی تعلق رہا۔ ان کے گھر پر ہر ہفتہ محفل مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی۔

(ابواللیث صدیقی' انتظام اللہ شہابی' مولانا عبدالسلام' "لکھنؤ کی آخری شمع" : ص ۵۶)

(۵۶) نعیم احمد' ڈاکٹر۔ "شہر آشوب کاتحقیقی مطالعہ" مطبوعہ ادبی اکادمی علی گڑھ (۱۹۷۹ء) ص ۱۸۴

(۵۷) کلیات منیر (دیوان اول : منتخب العالم) ص ۱۹۔ ۲۳

(۵۸) محمد شفیع' میاں : "۱۸۵۷ء۔ پہلی جنگ آزادی" مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور (۱۹۵۸ء)۔ بار دوم۔ ص ۱۵۰

(۵۹) Asoka Mehta "1857 - The Great Rebellion" Hind Kitabs Ltd. Bombay (1946)

(۶۰) Hunter, W.W. " Our Indian Muslimans" Comrade Publishers Calcutta (1945) PP-22-23

(۶۱) Asoka Mehta: "1857- The Great Rebellion" P 21-

(۶۲) Asoka Mehta: " 1857- The Great Rebellion" P 19-

(۶۳) سرسید احمد خان۔ " رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند" مطبوعہ یونی ورسٹی پبلشر' علی گڑھ (۱۹۵۸ء) ص۔ ۴۳

(۶۴) کلیات منیر (منتخب العالم' دیوان اول) ص۔ ۲۰۳

(۶۵) محمد ایوب قادری۔ "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" مطبوعہ پاک اکیڈمی کراچی (۱۹۷۶ء) ص ۲۵۹

(۶۶) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۴۹۰

(۶۷) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۴۹۰

(۶۸) کلیات منیر (دیوان سوم ' نظم منیر) ص ۴۹۰

(۶۹) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۱۶۰

(۷۰) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۴۹۰

(۷۱) Drake Brookman "Gazetteer of Banda" -Allahabad ('909) P-169

(۷۲) " Gazetteer of Banda" P-170

(۷۳) مرزا عباس بیگ نادر کے آبا و اجداد' ایران سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے تھے۔ نادر کی ولادت یہیں ہوئی۔ وہ ریاست باندہ میں وزارت کے عہدہ پر فائز ہونے سے پیشتر ریاست رامپور میں خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ مرزا عباس کا شمار بریلی کے استاد شعراء میں ہوتا تھا۔ آپ ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر تھے۔ وہ آتش اور ناسخ دونوں سے فیض یاب ہو چکے تھے جیسا کہ ان کے ایک شعر سے واضح ہے۔ ۔

مشاعرے میں غزل کیا چمکتی اے عباس

جو فیضِ آتش و ناسخ نہ کام کر جاتا

مرزا عباس بیگ پہلے عباس تخلص کرتے تھے مگر بعد میں آتش کے مشورہ سے نادر تخلص اختیار کیا- نادر تخلص کا انتخاب انہوں نے اپنے دادا کے عہدہ کی مناسبت سے اختیار کیا تھا جو نادر شاہ بادشاہ کے مصاحب تھے- نادر بڑے حوصلے کے آدمی تھے- "جرم بغاوت" میں جب باندہ میں ان کو دار پر کھینچا گیا- یہ شعر ان کی زبان پر تھا- ؎

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

وفات کے وقت، مرزا عباس بیگ نادر کی عمر چالیس برس تھی- نادر نے سات دیوان غیر مطبوعہ اپنی یاد گار چھوڑے جو جنگ آزادی کے ہنگامے میں تلف ہوگئے- اسکے علاوہ رجب علی بیگ سرور کے مشہور قصے "فسانہ عجائب" کو انہوں نے منظوم کیا تھا- ان کا ایک دیوان ان کے صاحبزادے مرزا رستم بیگ قیصر کے پاس تھا جو شائع ہو چکا ہے-
(امداد صابری " ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" مطبوعہ مکتبہ شاہراہ دہلی- (۱۹۵۹ء) ص ۳۰۲، ۳۰۳)

(۷۴) کلیات منیر (دیوان سوم، لظم منیر) ص ۴۸۷

(۷۵) Surrendra Nath : " Eighteen Fifty Seven" Ministry of Information & Broadcasting Govt. of India: (Mav 1957) P- 358.

(۷۶) کمال الدین حیدر، سید- "قیصر التواریخ" (جلد دوم) مطبوعہ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ (ستمبر ۱۸۹۶ء) ص ۳۲۱

(۷۷) ناصر خاں، فرخ آباد کے باشندے تھے اور خاندانی اعتبار سے بنگش پٹھان تھے- آپ نواب قائم علی خاں کے داماد اور محمد قاسم خاں کے فرزند تھے- ناصر خاں، فارسی کے زبردست شاعر بھی تھے- کہتے ہیں کہ آپ کا کلام نظامی کے ہم پلہ تھا- ان کا "لیلیٰ مجنوں" کا قصہ بہت مشہور تھا- عشق کی مدح و تعریف میں انہوں نے ایک مثنوی لکھی تھی-

ہرسر کہ ز عشقِ ما خبر نیست
ہاں برسرے سنگ زن کہ سر نیست
ہر سر کہ ز سرِ عشق خالی ست
اما بنگہ شگفتہ حالی ست
ہر سر کہ بہ عشقِ گرم خوں نیست
شائستۂ درگہہِ جنوں نیست
دل کز درِ عشق رتبہ حاصل
بے عشق خرابہ ایست بیدل
آباد حریم دل ز عشق است
آمیزشِ آب و گل ز عشق است

(تاریخ فرخ آباد (قلمی) ص- ۳۵۷- "بحوالہ ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" (امداد صابری) ص- ۳۶۹- ۳۶۸

(۷۸) Russell Sir W.H. _" My Diary in India in the Year 1858-59 (Vol II) London 1860. P 395.

(۷۹) کلیات منیر (دیوان سوم، لظم منیر) ص ۴۹۱

(۸۰) امداد صابری- "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" ص- ۳۶۹ -۳۷۰

(۸۱) کلیات منیر (دیوان سوم، لظم منیر) ص ۴۹۱

(۸۲) کلیات منیر (دیوان سوم، لظم منیر) ص ۳۵

(۸۳) ثابت رضوی، سید افضل حسین- "دربار حسین موسوم بہ چراغ مجالس" مطبع اثنا عشری، دہلی (۱۳۳۸ھ) ص ۲۸

(۸۴) کلیات منیر (دیوان سوم، لظم منیر) ص ۲۶۳- ۲۶۴

(۸۵) کلیات منیر (دیوان سوم، لظم منیر) ص ۲۰۷

(۸۶) کلیات منیر (دیوان دوم، تنویر الاشعار) ص ۳۴۸

(۸۷) کلیات منیر (دیوان اول، منتخب العالم) ص ۳۱۰

(۸۸) کلیات منیر (دیوان سوم، لظم منیر) ص ۴۹۵

(۸۹) کلیات منیر (دیوان سوم، لظم منیر) ص ۱۷۴، ۱۷۶

(۹۰) ہفت روزہ اخبار "کوہ نور" لاہور (اشاعت ۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء) مخزونہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز- نئی دہلی

(۹۱) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۳۱۰- ۳۱۱

(۹۲) حامی' بشن نرائن- "منیر شکوہ آبادی" مضمون' مطبوعہ پندرہ روزہ "آج کل" دہلی- ۱۵ ستمبر ۱۹۴۹ء- ص ٦

(۹۳) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر)- "قطعہ تاریخ مصائب و حالات زنداں"- ص ۴۹٦

(۹۴) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۳۳۸- ۳۴۰

(۹۵) ہفت روزہ اخبار "کوہ نور" لاہور (اشاعت ۱۷ نومبر- ۱۸٦۰ء) مخزونہ' انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز' نئی دہلی

(۹٦) ہفت روزہ اخبار "کوہ نور" لاہور (اشاعت ۱۵ دسمبر ۱۸٦۰ء) مخزونہ' انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز' نئی دہلی

(۹۷) خلیج بنگال میں واقع جزائر نکو بار اور انڈمان کا مجموعی رقبہ ۳۱۴۳ مربع میل ہے- ۱۹۲۱ء (مطابق ۱۳۳۹- ۱۳۴۰ھ) میں یہاں کی کل آبادی چھبیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی- پورٹ بلیر ان جزائر کا انتظامی صدر مقام ہے جو کلکتہ سے ۷۸۰ میل' مدراس سے ۷۴۰ میل اور رنگون سے ۳٦۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے- ان بندرگاہوں سے آنے جانے والے جہاز برابر یہاں سے گزرتے تھے- شروع ہی سے انگریزوں نے ان جزائر کو سزائے حبس دوام بہ عبور دریائے شور کے لئے تجویز کیا تھا مگر خرابیٔ آب و ہوا کے سبب ۱۷۲٦ء (مطابق ۱۱۳۸ھ) میں جزائر ویران ہوگئے- اس زمانہ میں جب سمندری سفر اتنا محفوظ نہ تھا' آنے جانے والے جہازوں کا عملہ' بحری قزاقوں کے خوف سے اور شدید سمندری طوفانی حالت سے ہراساں رہتا تھا' اس کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو دفاعی نقطۂ نظر سے بھی کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جو رنگون' مدراس اور کلکتہ کے درمیان ہو جہاں اس کے تجارتی جہاز اس طویل سفر میں قیام کرسکیں' چنانچہ اس مقصد کے لئے ۱۷۸۸ء (مطابق ۱۲۰۲ھ) میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے آر کی بالڈ بلیر (Archibald Blair) کو ان جزائر کا سفر کرنے اور یہاں ایک آبادی قائم کرنے پر مامور کیا- لیفٹیننٹ بلیر نے اس مقصد کے لئے جس مقام کا انتخاب کیا وہ اب پورٹ بلیر کہلاتا ہے- شروع میں سزا یافتہ لوگوں کو بطور مزدور یہاں بھیجا جاتا مگر جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں مجاہدین کی ایک کثیر تعداد کو سزا دینا ضروری سمجھا گیا تو اسی برس نومبر میں یہ فیصلہ کیاگیا کہ ان جزیروں کو پھر سزائے حبس دوام کے لئے کام میں لایا جائے چنانچہ یہ جزائر ایک بار پھر آباد ہوگئے-

"Imperial Gazetteer of India" Vol. V.-P351-360'

Pears Gazetteer of the World (Pears' Cyclopaedia) P-486'

Aspinall 'A- "Cornwallis In Bengal" -Manchester University Press (1931) P 188-190)

(۹۸) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۳۷۰- ۳۷۲

(۹۹) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۴۹۷- ۴۹۸

(۱۰۰) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۵۸

(۱۰۱) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۴۹۸

(۱۰۲) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۳۱۴- ۳۱۵

(۱۰۳) لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۴٦۹- "ادبی جائزے" ص ۱۲۳- "دربار حسین" ص ۲۸' -مضمون بدر حسن افضل مطبوعہ "اردوئے معلیٰ" علی گڑھ اپریل ۱۹۰۵ء' ص ۲٦- ضیاء احمد بدایونی "منیر شکوہ آبادی" مطبوعہ علی گڑھ میگزین مارچ' اپریل ۱۹۲۸ء' ص ۹۴- قاضی معراج دھولپوری "میر محمد اسماعیل منیر شکوہ آبادی" مطبوعہ "ہماری زبان" ۲۲ اکتوبر ۵۹ء 'ص ۱۱- ہفت روزہ "تنقید" بمبئی (منیر شکوہ آبادی نمبر) ص ٦- خواجہ احمد فاروقی "جنگ آزادی میں اردو کا حصہ" مشمولہ کلاسیکی ادب' مطبوعہ آزاد کتاب گھر دہلی (۱۹۵۳ء) ص ۲۷- (خواجہ احمد فاروقی نے اپنے مضمون میں جو منیر کا قطعہ انڈمان میں تکالیف کے ثبوت میں پیش کیا ہے' وہ دراصل باندہ جیل میں ان پر گزرنے والی اذیتوں اور سزا کے بعد باندہ سے الہ آباد اور الہ آباد سے کلکتہ تک سفر کی صعوبتوں کے بارے میں ہے نہ کہ انڈمان کی تکالیف سے متعلق- (راقم)

(۱۰۴) "مسدس تہنیت جشن بے نظیر" ص ۵۷- محمد عمر نور الٰہی "مثنوی حجابِ زناں" مطبوعہ "اردو" اپریل ۱۹۳٦' ص ۱۳۸- اثر رام پوری' محمد علی خاں "منیر شکوہ آبادی" مطبوعہ "ہماری زبان" علی گڑھ ۲۲ ستمبر ۱۹۵٦ء' ص ۱- دلدار نصری "منیر شکوہ آبادی اور رام پور" مطبوعہ روزنامہ "ناظم" رام پور' ۲٦ جنوری ۱۹۸۳ء- ناطق لکھنوی' حکیم "نظم اردو" مطبوعہ ظفر المطابع لکھنؤ (۱۹۴۱ء) بار دوم- ص ۱۸۸-

(۱۰۵) تاریخ ادب- اردو، ص ۲۴۱
(۱۰۶) کیفی چڑیا کوٹی، محمد مبین- "جواہر سخن" جلد چہارم، مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد (۱۹۳۹ء) ص ۹۳
(۱۰۷) یاسمین، ڈاکٹر زہرہ بیگم- "منیر شکوہ آبادی، سوانح حیات و کلام" مطبوعہ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ- ص ٦۷
(۱۰۸) نارنگ، گوپی چند- "۱۸۵۷ء اور اردو شعراء" مطبوعہ "نگار" دسمبر ۱۹۵۷ء- ص ۱۴
(۱۰۹) کلیات منیر (دیوان اول، منتخب العالم) ص ۳۲۴
(۱۱۰) حامی، بشن نرائن- "منیر شکوہ آبادی"- ص ٦
(۱۱۱) کلیات منیر (نظم منیر، دیوان سوم- حصہ نثر) ص ٦۴۹
(۱۱۲) کلیات منیر (دیوان دوم، تنویر الاشعار) ص ۵۹۰
(۱۱۳) کلیات منیر (دیوان سوم، نظم منیر، حصہ نثر) ص ٦۳۴، ٦۳۵
(۱۱۴) کلیات منیر (دیوان سوم، نظم منیر) ص ۴۹٦
(۱۱۵) یاسمین، ڈاکٹر زہرہ بیگم- "منیر شکوہ آبادی، سوانح حیات و کلام"- ص ٦٦-٦۷
(۱۱٦) نارنگ، گوپی چند- "۱۸۵۷ء اور اردو شعراء" ص ۱۴- حامی، بشن نرائن- "منیر شکوہ آبادی"- ص ٦
(۱۱۷) نارنگ، گوپی چند- "۱۸۵۷ء اور اردو شعراء"- ص ۱۴
(۱۱۸) ہفت روزہ اخبار "کوہ نور" لاہور، اشاعت ۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء، مخزونہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز، نئی دہلی
(۱۱۹) (کلیات منیر، دیوان سوم، نظم منیر) ص- ۴۹۷

(۱۲۰) محمد احد علی- "شباب لکھنؤ"- مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ (۱۹۱۲ء) ص ۵۲
(۱۲۱) اختر، محمد واجد علی شاہ- "حزنِ اختر" مطبوعہ دائرہ ادبیہ لکھنؤ (۱۹۲۲ء) ص ۸۰
(۱۲۲) کلیات منیر (دیوان سوم، نظم منیر) ص ۵۰۱
(۱۲۳) کلیات منیر (دیوان سوم، نظم منیر) ص ۴۹۵
(۱۲۴) کلیات منیر (دیوان سوم، حصہ نثر) عبار تیکہ بر خاتمہ بعض اشعار خود- ص ٦۱۴
(۱۲۵) کشفی، ابوالخیر- "اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر" مطبوعہ ادبی پبلیکیشنز کراچی (۱۹۷۵ء) ص ۳۳۷
(۱۲٦) وتاسی، گارساں- "خطبات" مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (۱۹۳۵ء) ص ۸۰۲
(۱۲۷) "شعر و سخن" کا ایک نسخہ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی کے کتب خانہ میں موجود ہے-
(۱۲۸) قادری، حامد حسن- "آگرے کے قدیم مشاعرے" مشمولہ "نقد و نظر"- ص ۱۸۷
(۱۲۹) خط محررہ ۲۵ جون ۱۹۸۰ء، بنام اسعد بدایونی
(۱۳۰) شاہ مبین الہ آبادی، مقدمہ "سنان دل خراش"- ص ۴
(۱۳۱) لکھنؤ کا دبستان شاعری- ص ۴٦۹
(۱۳۲) کلیات منیر (دیوان سوم، نظم منیر) ص ۸-۹
(۱۳۳) کلیات منیر (دیوان سوم، نظم منیر) ص ۹
(۱۳۴) کلیات منیر (دیوان سوم، نظم منیر) ص ۹-۱۱
(۱۳۵) کلیات منیر (دیوان سوم، نظم منیر) ص ۱۰
(۱۳٦) کلیات منیر (دیوان سوم، نظم منیر) ص ۱۰
(۱۳۷) کلیات منیر (دیوان سوم، نظم منیر) ص ۱۱
(۱۳۸) قیصر التواریخ، جلد دوم- ص ۴۵۵
(۱۳۹) کلیات منیر (دیوان سوم، نظم منیر) ص ۱۸۰- ۱۸۲
(۱۴۰) کلیات منیر (دیوان سوم، نظم منیر) ص ۱۷۹- ۱۸۰
(۱۴۱) نعیم احمد ڈاکٹر- "شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ" -ص ۲۷۲
(۱۴۲) کلیات منیر (دیوان سوم، نظم منیر) ص ۹

(۱۴۳) محمد جعفر تھانیسری "کالا پانی" مطبوعہ شیر اکیڈمی' لاہور- ص ۳۱- ۳۲
(۱۴۴) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۴۹۶
(۱۴۵) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر- حصہ نثر) ص ۶۰۹
(۱۴۶) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۴۷۳
(۱۴۷) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۶۱۱- ۶۱۲
(۱۴۸) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۴۷۳
(۱۴۹) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۴۷۱
(۱۵۰) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۴۷۲
(۱۵۱) کلیات منیر (دیوان سوم'نظم منیر) ص ۴۷۱
(۱۵۲) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۴۷۳
(۱۵۳) یات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۴۹۹
(۱۵۴) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر- حصہ نثر) ص ۶۱۳
(۱۵۵) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۵۰۲
(۱۵۶) فضل حق خیر آبادی' مولانا' "الثورۃ الہندیہ" (باغی ہندوستان) ترجمہ و ترتیب عبدالشاہد خاں شیروانی- مطبوعہ مدینہ پریس' بجنور ۱۹۴۷ء- ص ۴۲۵
(۱۵۷) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۴۷۰
(۱۵۸) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۳۱۳
(۱۵۹) کلیات منیر (نظم منیر'دیوان سوم) ص ۳۷۸
(۱۶۰) کلیات منیر (نظم منیر'دیوان سوم) ص ۲۹۱
(۱۶۱) محمد جعفر تھانیسری- "کالا پانی"- ص ۳۴' ۳۵
(۱۶۲) کلیات منیر (حصہ نثر' رقعات) ص ۶۰۹
(۱۶۳) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۳۳۸
(۱۶۴) کلیات منیر (حصہ نثر' رقعات) ص ۶۰۷
(۱۶۵) کلیات منیر (حصہ نثر' رقعات) ص ۶۰۹
(۱۶۶) کلیات منیر (حصہ نثر' رقعات) ص ۶۰۹
(۱۶۷) امپریل گزیٹیئر آف انڈیا' جلد پنجم- ص ۱۹۸
(۱۶۸) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۴۹۸
(۱۶۹) مولوی مظہر کریم جو منّتی کے نام سے معروف تھے دریا باد کے رہنے والے اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے دادا تھے- ان کے والد شیخ مخدوم بخش تھے جن کا تعلق دریا باد کے قدوائی خاندان سے تھا- مظہر کریم جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے وقت شاہ جہانپور (یو-پی) میں سررشتہ دار عدالت اور انگریز کے ملازم تھے- شاہ جہاں پور میں تحریک آزادی میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا- انقلاب کے بعد گرفتار ہوئے اور انڈمان بھیجے گئے-
(محمد ایوب قادری' ڈاکٹر- "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء- واقعات و شخصیات" مطبوعہ پاک اکیڈمی کراچی (۱۹۷۶ء) ص ۴۴۸' ۴۴۹
(۱۷۰) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۴۹۹
(۱۷۱) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۱۱
(۱۷۲) مولانا فضل حق خیرآبادی' ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں خیرآباد کے مقام پر پیدا ہوئے- آپ کے والد مولوی فضل امام' عہد انگریزی میں دہلی کے صدر الصدور تھے- مولانا فضل حق بھی کچھ عرصہ کمشنر دہلی کے دفتر میں پیش کار رہے- مرزا غالب سے ان کے دوستانہ مراسم تھے- فضل حق ایک عرصہ تک مختلف چھوٹی بڑی ریاستوں میں ملازم رہے جن میں لکھنؤ اور رام پور کی ریاستیں بھی شامل ہیں- ۱۸۵۷ء میں انہوں نے جنرل بخت خاں کا ساتھ دیا جس کے نتیجہ میں گرفتار ہوئے' مقدمہ

چلا اور حبس بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء) میں انڈمان ہی میں انتقال ہوا۔ مولانا علوم معقول کے منتہی اور ایک کثیرا لتصانیف مصنف تھے۔ قیام انڈمان کی یادگار ان کی دو تصانیف ہیں (ا) الثورۃ الہندیہ (۲) قصائد فتنہ الہند"الثورۃ الہندیہ" کا اردو ترجمہ مولانا عبدالشاہد خان شیروانی نے "باغی ہندوستان" کے نام سے ۱۹۴۷ء میں شائع کر دیا ہے۔ شیروانی نے مولانا فضل حق خیرآبادی کی سولہ تصانیف کے نام اپنے دیباچہ میں گنوائے ہیں۔ ان کے علاوہ نادم سیتاپوری نے اپنے مضمون "غالب اور فضل حق خیرآبادی" میں فضل حق خیرآبادی کے ۱۷' ۱۸ غیر مطبوعہ قصائد کی نشان دہی بھی کی ہے جو انہوں نے سید جمیل الدین احمد قادری کے کتب خانہ' واقع بمبئی میں دیکھے تھے۔
(نادم سیتاپوری۔ "غالب نام آورم" مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ۔ ۱۹۶۱ء۔ ص ۱۲۰)

(۱۷۳) کلیات منیر(دیوان سوم' نظم منیر) ص ۵۰
(۱۷۴) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۴۳
(۱۷۵) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۵۰
(۱۷۶) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۵۰۲
(۱۷۷) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم' حصہ نثر۔ رقعات) ص ۶۱۲
(۱۷۸) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۱۸۶
(۱۷۹) کلیات منیر (حصہ نثر۔ رقعات)۔ ص ۶۱۳
(۱۸۰) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۳۶۷
(۱۸۱) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۵۰۵
(۱۸۲) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۵۰۴
(۱۸۳) تفصیل کے لئے دیکھئے "منیر شکوہ آبادی' احوال و آثار"۔ مقالہ از راقم
(۱۸۴) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر) ص ۵۰۴۔ ۵۰۵
(۱۸۵) داروغہ سید واجد علی تسخیر لکھنؤ کے رئیس تھے۔ تسخیر جناب امیر لکھنوی کے ارشدہ تلامذہ میں تھے اور واجد علی شاہ کی بیگم سلطان محل کے داروغہ تھے۔ اس کے علاوہ محلات شاہی کی کچھ اور خدمات بھی ان کے سپرد تھیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب لکھنؤ میں برجیس قدر اور حضرت محل کی قیادت میں جنگی کونسل تشکیل دی گئی تو تسخیر بھی اس میں شامل تھے۔ تسخیر درپردہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔ انہوں نے دنیوی لالچ کی وجہ سے بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائیں اور جب بھی موقع ملتا' چالاکی اور مکاری سے مجاہدین کو نقصان پہنچانے اور ان کو بددل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بعد فتح لکھنؤ انگریزوں نے خیر خواہی کے صلہ میں کئی گاؤں بطور انعام دیئے' نقد روپے بھی سرکار انگریزی سے وصول کئے اور لکھنؤ کے تعلقہ داروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ لالہ سری رام مولف "خم خانہ جاوید" تسخیر کی غداری کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> "ایام غدر میں جب مرزا برجیس قدر کا دور دورہ ہوا تب آپ حضرت محل کے صلاح کاروں میں رہے مگر جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ اس بدنظمی کا انجام اچھا نہیں تو ازراہ دور اندیشی آپ سرکار انگلیشہ کے ہوا خواہ بن گئے اور خدمات شائستہ اس سرکار کی ادائیں' چنانچہ بہ مدد و خیر خواہی بعد فرو ہنگامہ چند مواضع بطور انعام پائے اور زمرۂ تعلقہ داروں میں محسوب کئے گئے۔"

(سری رام' لالہ۔ "خم خانۂ جاوید" جلد دوم۔ مطبوعہ امپریل بک ڈپو' دہلی (۱۹۱۱ء) ص ۵۶

کبھی کبھی جب آدمی کا احساسِ گناہ اس کو دباتا ہے تو وہ دینداری میں زیادہ شدید شغف کا اظہار کرنے لگتا ہے تاکہ لوگ اس کو اچھا سمجھیں اور خود اس کے ضمیر کا بوجھ بھی کم ہو جائے۔ یہی صورت حال ہمیں تسخیر کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ منشی نول کشور' مولف "گلدستۂ سخن" ان کی کرداری خصوصیات اور مخفی زندگی کے اس پہلو کو اس طرح اجاگر کرتے ہیں۔

" اخلاق و مروت' یگانۂ روزگار' یاروں کے یار' جس سے محبت ہے پاک دل سے' مذہبی عقائد میں سچے دیندار' ہر سال متواتر مجلس اور خیرات اور خصوصاً عشرہ محرم میں یکم تاریخ سے عشرہ برابر تقسیم پخت اور مجلس ہوتی ہیں۔"
(امداد صابری۔ ۱۸۵۷ء کے غدار شعراء ص ۳۱ تا ۳۹)

نمونہ کلام یہ ہے

نہ آیا فاتحہ پڑھنے وہ مہ رو مہرباں ہو کر
لحد میں یاد جب آئی کشاکش زلفِ پیچاں کی
نہ کھینچ اب تیغ ابرو' دل نشانہ ہو چکا ظالم
اسے دن رات پامالی' اسے چکر میں بے حالی
عدم میں جانے والے منزلِ آخر پہ جا پہنچے
نزاکت کس قدر ہے پھول کے گجرے جو پہنے ہیں
نجف کی راہ لو' تسخیر پھرتے ہو کہاں در در

زمینِ قبر کیوں پیسے نہ ہم کو آسماں ہو کر
کفن کے بند جتنے تھے وہ لپٹے رسیاں ہو کر
در آئی ہر مژہ کی نوک سینے میں سناں ہو کر
نہ یاں راحت زمیں ہو کر نہ آرام آسماں ہو کر
میں تنہا رہ گیا پیچھے' غبارِ کارواں ہو کر
جھکے جاتے ہیں دونوں ہاتھ گل کی ڈالیاں ہو کر
لگاؤ بسترا مولیٰ کے در پر پاسباں ہو کر

(۱۸۶) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر- حصہ نثر) ص ۶۰۰- ۶۰۲

(۱۸۷) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر' حصہ نثر) خط بنام حافظ منشی سید ولی حیدر فرخ آبادی- ص ۶۱۵

(۱۸۸) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر)- ص ۵۲۳

(۱۸۹) کلیات منیر (دیوان سوم' نظم منیر)- ص ۹۴

(۱۹۰) District Qazetteer of the U.P. -Rampur State (Allah abad 1911- P 112)

(۱۹۱) ادیب' ڈاکٹر لطیف حسین' "روہیلوں کے دور حکومت میں اردو شاعری کا فروغ" مطبوعہ مجلّہ "معارف" اعظم گڑھ' شمارہ اگست ۱۹۶۰ء

(۱۹۲) سحر' ڈاکٹر ابو محمد- "مطالعۂ امیر" مطبوعہ نسیم بک ڈپو' لکھنؤ (۱۹۶۵ء) ص ۵۵

(۱۹۳) فائق رام پوری' کلب علی خاں- "یادرفتگاں- رام پور کا ادبی مرکز"- "نگار" مارچ ۵۳ء- ص ۹-۱۰

(۱۹۴) نواب کلب علی خاں' ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء) دہلی میں پیدا ہوئے- ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں اپنے والد نواب یوسف علی خاں ناظم کی جگہ مسند نشین حکومت ہوئے- نواب' ان کا منصب بھی تھا' اور تخلص بھی- اسیر اور امیر مینائی سے تلمذ تھا- معقول و منقول کا درس انہوں نے مولانا فضل حق خیر آبادی سے لیا- ان کے اساتذہ میں' مولوی محمد حیات' مولوی جمال الدین' مولوی عبدالعلی اور مولوی غیاث الدین رام پوری کے نام آتے ہیں- پہلے اردو اور فارسی نثر لکھنے کی کوشش کی- ان کی نثری کاوشوں میں "بلبلِ نغمہ سنج" "ترانۂ غم" "قندیلِ حرم" اور "شگوفۂ خسروی" زیادہ مشہور ہیں- ایک دیوان فارسی اور چار دیوان اردو مطبوعہ "نشیدِ خسروانی" "دستنبو خاقانی" درۃ الانتخاب" اور "توقیعِ سخن" ان کی یادگار ہیں- ۱۳۰۴ھ (۸۷-۱۸۸۶ء) میں انتقال ہوا-

نمونہ کلام یہ ہے:

کیوں عرش پہ الاماں بہت ہے — کیا سینے میں دل طپاں بہت ہے
اے موئے کمر' الجھ نہ دل سے — تجھ سے بھی یہ ناتواں بہت ہے
تھوڑا سا غمِ فراق اس کا — دل کو پئے امتحاں بہت ہے
کس کی ہے تلاش اس کو یارب — گردش میں جو آسماں بہت ہے
کیا چھوڑیں سوائے بے نشانی — دنیا میں یہی نشاں بہت ہے
کہتے نہیں کچھ بھی جز غمِ دل — یوں کہنے کو داستاں بہت ہے
کچھ فکر نہ کر کہ جانِ غمگیں — غم سے ترے شادماں بہت ہے

کیا نوحے رکئے ہیں تو نے' نواب
جو شورشِ الاماں بہت ہے

("تذکرہ "نگارستان سخن" تالیف نورالحسن خاں- مرتبہ عطا کاکوی'،مطبوعہ آرٹ پریس'پٹنہ : (۱۳۸۸ھ) ص ۶۱)
("دستنبو خاقانی" (دیوان دوم' نواب کلب علی خاں) مطبوعہ تاج المطابع' رام پور (۱۲۹۵ھ) ص ۱۸۰-۱۸۲)

(۱۹۵) کلیات منیر- ص ۸۳

(۱۹۶) شیخ امداد علی نام' بحر تخلص- والد کا نام شیخ امام بخش تھا- ناسخ کے نامور شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے- بحر کی کلیات شائع ہو چکی ہے- عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ میں بسر ہوا- آخر عمر میں رام پور آ گئے- ۷۵ سال کی عمر میں' ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۳ء) میں انتقال ہوا-

(۱۹۷) منشی مظفر علی امیر، قصبہ امیٹھی میں پیدا ہوئے جو اودھ کے مضافات میں واقع ہے۔ بچپن میں لکھنؤ آگئے تھے۔ نصیرالدین حیدر کے زمانہ سے واجد علی شاہ کے عہد تک مختلف ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ تدبیر الدولہ، مدبر الملک، بہادر جنگ ان کا خطاب تھا۔نواب محمد سعید خاں کے عہد میں، لکھنؤ سے رام پور آئے۔ امیر مصحفی کے شاگرد تھے۔ شاعری کے علاوہ، امیر نے سات داستانیں بھی تصنیف کیں۔ وفات ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں ہوئی۔

(۱۹۸) امیراحمد نام، امیر تخلص، حضرت شاہ مینا کی اولاد سے تھے اس لئے مینائی مشہور ہوئے۔ ۱۲۴۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ فرنگی محل میں علوم فارسی و عربی کی تکمیل کی۔ شاعری میں مظفر علی خاں اسیر کے شاگرد تھے۔ ان کے علم و فضل کی قدر دانی کرتے ہوئے، واجد علی شاہ نے ۱۲۶۹ھ میں داخل دربار کیا۔ بعد انتزاع سلطنت اودھ، نواب یوسف علی خاں ناظم نے رام پور بلوا لیا اور عدالت دیوانی کا مفتی مقرر کیا۔ امیر کا بڑا کارنامہ ان کی لغات کی ترتیب ہے۔ امیراللغات کی صرف دو جلدیں شائع ہو سکی ہیں۔ نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد امیر حیدر آباد دکن چلے گئے اور وہیں ۱۳۱۸ھ میں انتقال ہوا۔ صنم خانۂ عشق، مراۃ الغیب، جوہر انتخاب اور گوہر انتخاب، ان کے مطبوعہ دواوین ہیں۔

(۱۹۹) احمد حسن خاں نام، عروج تخلص۔ والد کا نام منشی محمد حسن خاں تھا۔ اناؤ کے قصبہ آسیون کے رہنے والے تھے۔ عروج کی پیدائش فرخ آباد میں ہوئی۔ عمر کا بیشتر حصہ دہلی اور لکھنؤ میں بسر ہوا۔ آخر میں کان پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ عروج، منیر کے خاص دوستوں میں تھے کیونکہ منیر ہی کی طرح وہ بھی ناسخ اور رشک کے شاگرد تھے۔ ۱۲۸۸ھ میں رام پور آگئے تھے جہاں رجسٹرار مقرر ہوئے، اس سے پہلے وہ دہلی میں ریذیڈنسی میں ملازمت کر چکے تھے۔ کان پور میں۱۳۱۲ھ میں انتقال ہوا۔

(۲۰۰) معروف غزل گو شاعر، نواب مرزا داغ، نواب شمس الدین کے فرزند تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور قلعہ معلیٰ کے شاعرانہ ماحول میں ہوش سنبھالا۔ استادِ شاہ شیخ ابراہیم ذوق کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مع اہل و عیال رام پور آگئے۔ نواب یوسف علی خاں نے بڑی قدر کی۔ داغ تقریباً چالیس برس رام پور میں رہے۔ نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد حیدر آباد دکن چلے گئے اور وہیں بہ عارضہ فالج ۱۳۲۲ھ میں انتقال ہوا۔ گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ اور یادگار داغ ان کے مجموعہ ہائے کلام ہیں۔ ایک مثنوی، فریاد داغ کے نام سے لکھی جو خاص شہرت کی حامل ہے۔

(۲۰۱) حکیم سید ضامن علی، جلال تخلص۔ والد کا نام حکیم اصغرعلی۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ جلال منیر کے استاد بھائی اور علی اوسط رشک کے شاگرد تھے۔ ۱۲۷۲ھ میں بہ عہد نواب یوسف علی خاں رام پور آئے۔ نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد ریاست منگرول چلے گئے مگر بعد میں نواب حامد علی خاں نے ان کا وظیفہ بحال کر دیا۔ باقی عمر لکھنؤ میں گزری۔ شاعری کے علاوہ ایک داستان "بالا باختر" بھی تصنیف کی جس کا مخطوطہ رضا اسٹیٹ لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ ۱۳۲۵ھ میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ جلال کے چار دیوان ہیں، اس کے علاوہ سرمایۂ زبانِ اردو، افادہ تاریخ، منتخب القواعد، مقالہ دستور الفصحا، اور مفید الشعراء مختلف علمی موضوعات پر ان کی تصانیف ہیں۔ دو لغات بھی زبان اردو کے مرتب کئے، جن کے نام " تنقیح اللغات" اور "گلشن فیض" ہیں۔

(۲۰۲) صاحب عالم مرزا رحیم الدین نام اور حیا تخلص تھا۔ ان کے والد صاحب عالم مرزا کریم الدین تھے جو شاہ عالم ثانی کے پوتے تھے۔ قلعہ معلیٰ میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ شعر گوئی کے علاوہ، شطرنج کے بھی ماہر تھے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے بنارس کا سفر کیا تھا اور اس سفر کے دوران کچھ دن نواب یوسف علی خاں ناظم کے مہمان بھی رہے۔ بعد زوال سلطنت دہلی، مستقلاً" رام پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔نواب کلب علی خاں نے ازراہ قدردانی اپنا مصاحب بنایا ہوا تھا۔ حیا کے چھوٹے بھائی کا بیان ہے کہ وہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے دو سال قبل ہی رام پور آگئے تھے۔ ۱۳۰۴ھ میں رام پور ہی میں انتقال ہوا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ مرزا حیا کے بڑے بیٹے مرزا علیم الدین کو رام پور میں ایک داستاں گو کی حیثیت سے شہرت ملی۔ان کی متعدد داستانیں، رام پور کی اسٹیٹ لائبریری میں محفوظ ہیں۔

(۲۰۳) آغا مرزا شاغل، دہلی کے رہنے والے اور مشہور غزل گو شاعر نواب مرزا داغ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے والد آغا تراب علی تھے۔ جنگ آزادی کے خاتمہ پر رام پور میں مستقلاً" آگئے اور یہاں سرکاری ملازم ہوئے۔ شاعری میں اپنے برادر بزرگ نواب مرزا داغ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۸۰ء میں رام پور ہی میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہیں۔

(۲۰۴) منشی سید صابر حسین نام، صبا تخلص تھا۔ والد محمد احتشام الدین صدیقی سہوان ضلع بدایوں کے باشندہ تھے۔ صبا، پہلے ریاست بھوپال میں ناظم ضلع مشرقی تھے، بعد میں رام پور میں آکر ملازم ہوئے۔ صبا فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں مولوی نجف علی خاں اور اردو میں ایوب علی خان گلشن اور شیخ علی بخش بیمار سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ آخر عمر میں صبا، رام پور کی ملازمت ترک کرکے، بھوپال چلے گئے تھے اور وہیں ۱۳۱۳ھ میں انتقال ہوا۔

(۲۰۵) خواجہ محمد بشیر نام، بشیر تخلص تھا۔ آپ کے والد خواجہ نظام الدین تھے، ان کے بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ مگر بشیر کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ خواجہ محمد بشیر، اودھ میں بھی عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہے۔ بعد انتزاع سلطنت، ریاست رام پور آگئے تھے۔ ۳ جون ۱۸۸۰ء کو لکھنؤ ہی میں فوت ہوئے۔

(۲۰۶) بدر، کا نام سید ابو محمد تھا۔ یہ منشی منیر شکوہ آبادی کے فرزند تھے۔ ان کے حالات جس قدر بہم ہوسکے، منیر کے اعزاء کے عنوان کے تحت تحریر کر دیئے گئے ہیں۔

(۲۰۷) مرزا حسین علی خاں نام، شاداں تخلص تھا۔ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے اور خیالی تخلص کرتے تھے۔ شاداں، نواب زین العابدین عارف نبیرہ مرزا غالب کے فرزند ہیں۔ غالب ہی کے تعلق سے شاداں کو رام پور میں ملازمت ملی۔ "انتخاب یادگار" کی تصنیف کے وقت (۱۸۷۳ء) شاداں جوان تھے، منشی امیر مینائی نے ان کی عمر ۲۵ سال بتائی ہے۔ آخر عمر میں مالیخولیا اور وہم کے مرض میں مبتلا ہوگئے، اسی حالت میں انتقال ہوا۔ شاعری میں مولانا حالی اور نواب مرزا قربان علی بیگ سالک سے مشورہ کرتے تھے۔ ۱۲۹۲ھ میں وفات پائی۔

(۲۰۸) مرزا معین الدین حیدر نام اور غمیں تخلص تھا۔ ان کے والد کا نام، مرزا تاج الدین حیدر تھا جو لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ غمیں سرکاری ملازم تھے۔ مرزا کلب حسین خاں عرف مرزا خانی نوازش کے ممتاز شاگردوں میں غمیں کا شمار ہوتا ہے۔ مرزا غمیں ۱۸۵۷ء کے بعد رام پور پہنچے اور نواب زادگان کے استاد اور اتالیق مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں بہ عمر ۶۱ سال رام پور ہی میں انتقال ہوا۔

(۲۰۹) آغا علی نقی، غنی۔ ابن مرزا معین الدین حیدر غمیں۔ منشی منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے مگر بہ سلسلہ ملازمت، رام پور چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ آغا غنی، امیر مینائی کے اخبار "تاج الاخبار" کے ایڈیٹر تھے۔ اس کے علاوہ عدالت فوجداری میں ناظر کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ بوجہ بے اعتدالیوں کے عہدہ "میراخبار" سے معزول ہوئے۔ عمر کا آخری حصہ جیل میں گزرا، وہیں ۱۸۸۶ء میں انتقال ہوا۔

(۲۱۰) آغا محمد شیرازی نام، نثار تخلص۔ ان کے والد کا نام علی بابا شیرازی تھا جو شاعر بھی تھے اور شہرت تخلص کرتے تھے۔ نثار کی عمر، انتخاب یادگار کی تصنیف کے وقت (۱۲۹۰ھ) ۲۶ برس تھی۔ شاعری میں اپنے والد سے تلمذ تھا۔ نواب کلب علی خاں کے دور میں سرکاری ملازم تھے۔ نواب کلب علی خاں کا فارسی دیوان "تاج فرخی" بغرض اصلاح مرزا محمد علی خاں سپہر مولف "ناسخ التواریخ" کے پاس، نثار ہی لے کرگئے تھے۔ یہ واقعہ ۱۲۹۴ھ کا ہے مزید حالات پردۂ خفا میں ہیں۔

(۲۱۱) منصور علی منصور کا اصل نام سید زین العابدین تھا مگر اپنی عرفیت منصور علی سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ منصور کے والد کا نام سید حسن علی تھا۔ منصور کی پرورش انکے نانامولانا رستم علی کے گھر میں ہوئی۔ انہوں نے میاں رفیع الدر جات نزہت سے کسب علم کیا۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے، فارسی میں علی تخلص کرتے تھے۔ تاریخ گوئی میں حیرت انگیز حد تک منصور کو قدرت حاصل تھی۔ برجستہ تاریخ کہنے پر جو مہارت ان کو حاصل تھی، اس کی کئی مثالیں مولف "مسدس تہنیت جشن بے نظیر" نے بیان کی ہیں۔ منصور ایک درویش انسان تھے۔ دنیاوی مال و دولت کی ہوس دل میں قطعی نہ تھی۔ نواب یوسف علی خاں نے ان کا دس روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا جو ان کی ضروریات سے کہیں زیادہ تھا۔ ۱۳۰۶ھ میں رام پور ہی میں رحلت فرمائی۔

(۲۱۲) جان صاحب کا اصل نام میر یارعلی جان تھا لیکن ماں باپ پیار سے جان صاحب پکارتے تھے، اسی نام سے مشہور ہوئے۔ جان صاحب کی پیدائش غالباً ۱۲۳۴ھ میں بمقام فرخ آباد ہوئی۔ جان صاحب کا بچپن لکھنؤ میں گزرا اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ جان صاحب کو ریختی کہنے کے سبب شہرت حاصل ہوئی۔ جب تک لکھنؤ آباد رہا، یہ زبانوں اور امیروں سے داد سخن پاتے رہے۔ جان صاحب کا پہلا دیوان ۱۲۶۳ھ میں اور دوسرا دیوان ۱۲۷۹ھ میں شائع ہوا۔ بعد انتزاع سلطنت اودھ، جان صاحب رام پور آگئے اور درباری شعراء میں شامل ہوگئے۔ رام پور ہی میں انتقال ہوا۔

(۲۱۳) کلیات منیر (نظم منیر دیوان سوم) ص ۸۵

(۲۱۴) راز یزدانی :- "اصلاح زبان اردو اور مصاحب منزل رام پور" مطبوعہ "آجکل" دہلی۔ (جولائی ۱۹۵۷) ص ۴

(۲۱۵) District Gazetteer of the U.P.Rampur StateP-52

(۲۱۶) سکسینہ' رام بابو- '' تاریخ ادب اردو'' ص-۳۵۴

(۲۱۷) یار علی جان' میر- '' مسدس تہنیت جشن بے نظیر'' مرتبہ محمد علی خان اثر رامپوری' مطبوعہ اسٹیٹ پریس' رام پور (۱۹۵۰ء) ص ۵

(۲۱۸) کلیات منیر- ص ۵۲۵'۵۲'۸۸

(۲۱۹) کلیات منیر- (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۲۲۶

(۲۲۰) کلیات منیر- (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۳۳۱

(۲۲۱) کلیات منیر- (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۲۴۱

(۲۲۲) کلیات منیر- (نظم منیر' دیوان سوم' عرائض منظوم) ص ۱۵۰

(۲۲۳) کلیات منیر- (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۴۷۰

(۲۲۴) کلیات منیر- (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۳۱۶

(۲۲۵) جناب مجم' منیر کے حقیقی پوتے نہیں تھے۔ وہ جناب بزم اکبرآبادی کے فرزند تھے جو منیر کے رشتے کے بھانجے تھے۔ (راقم)

(۲۲۶) مجم آفندی' '' اسرار و افکار'' مطبوعہ ادارہ قدر ادب' حیدرآباد دکن (۱۹۷۱ء) ص ۱۲' ۱۳

(۲۲۷) '' اسرار و افکار'' - ص ۱۳' ۱۴

(۲۲۸) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۵۳۵

(۲۲۹) Temple,Richard: "India In 1880" John Murray London(1880) P-464

(۲۳۰) کلیات منیر (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۴۷۵'۴۷۶'۴۷۷

(۲۳۱) کلیات منیر- (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۴۸۰

(۲۳۲) کلیات منیر- (نظم منیر' دیوان سوم) ص ۲۸۷ - ۲۸۸

(۲۳۳) تفصیل کے لئے دیکھئے' منیر شکوہ آبادی- احوال و آثار'' مقالہ از راقم)

(۲۳۴) مہر' پروفیسر علی سجاد- '' کچھ یادیں' کچھ باتیں'' - ص ۳ (غیر مطبوعہ)

(۲۳۵) District Gazetter of the U.P.Rampur State:P-18

(۲۳۶) یار علی جان' میر- '' مسدس تہنیت جشن بے نظیر'' ص ۵۸

حبسیہ شاعری

۱- احمد دہلوی' سید- "فرہنگ آصفیہ" جلد دوم' مطبوعہ مکتبہ حسن سہیل لاہور' طبع سوم (پاکستانی ایڈیشن) ص ۱۵۶

۲- "جامع ترمذی"- جلد دوم- فرید بک سٹال لاہور (۱۴۰۴ھ / ۱۹۸۴ء) بار اول- ص ۹۸

۳- یہ اصولی مباحث اور بعض دوسری تفصیلات ڈاکٹر غلام حسین اظہر اور سعادت علی صدیقی کی تحریروں سے ماخوذ ہیں- (راقم)

۴- جلاوطنی کی سزا حضرت عمرؓ کی ایجاد ہے- آپ نے ابو محجن ثقفی کو بار بار شراب پینے کے جرم میں ایک جزیرے میں جلاوطن کر دیا تھا-

(مولانا امداد صابری- "تاریخ جرم و سزا" (جلد دوم) مطبوعہ بمبئی چوب پریس' دہلی (۱۹۴۵ء) ص ۲۷۰

۵- شرر' عبدالحلیم- "گزشتہ لکھنؤ" مطبوعہ گیلانی الیکٹرک پریس لاہور (س ن) ص ۳۲

۶- تنور درگا پرشاد مصنف "بوستان اودھ" اس سانحہ کی تفصیل اسطرح بیان کرتے ہیں' وہ لکھتے ہیں-

وزیر علی خان کی حکومت کی مدت ابھی صرف چار ماہ اور پانچ دن تھی کہ انگریزوں نے اس کو معزول کرکے انگریزی فوج کی حراست میں لکھنؤ سے بنارس بھیج دیا گیا- خان مذکور کے ذاتی اور خانگی مصارف کے لئے

ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ مقرر ہوئے۔ چند روز بہ عافیت بسر کئے مگر بہ سبب سودائے بغاوت اطراف شہر میں غوغا برپا کرنے لگا۔ چیری صاحب ریذیڈنٹ بنارس نے اس کو از راہ اخلاص سمجھایا مگر وزیر خان نے اس کو بھی قتل کر دیا اور اس کی کوٹھی میں آگ لگا کر دوسرے انگریزوں کے قتل پر آمادہ ہوا۔ غرض انگریز اس کی سرزنش پر آمادہ ہوئے۔ شکست کھا کر بڑی مشکل سے جان بچائی اور جے پور کے راجہ کے پاس پناہ لی۔ کرنل کالنیس' وزیر خاں کے تعاقب میں تھا۔ بالآخر اس نے وزیر علی خان کو جے پور سے قید کرکے کلکتہ روانہ کیا اور وہاں قلعہ فورٹ ولیم میں محبوس کر دیا۔ تاحیات اسی میں بسر کرکے یہ ماہ جون ۱۸۱۶ء مطابق ماہ شعبان ۱۲۳۲ھ چھتیس برس کی عمر میں قید حیات سے آزاد ہوا۔

(عبداللہ عاشق' مولوی۔ "بہارستان اودھ" (ترجمہ بوستان اودھ مصنفہ کنور درگا پرشاد' مطبوعہ منبع فیض پریس دہلی (س ن)۔ ص ۵۲-۵۵

۷۔ محمد نجم الغنی' مولوی۔ "تاریخ اودھ" جلد سوم۔ مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۹ء۔ ص ۳۸۶۔ معین الدین عقیل' ڈاکٹر۔ "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۷۶ء) ص۔ ۱۹۷۔ دوسرے شعر اور مقطع کا قافیہ محل نظر ہے۔ (راقم)

۸۔ ناصر' سعادت خان۔ "خوش معرکہ زیبا" جلد دوم مرتبہ مشفق خواجہ۔ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۷۲ء) ص ۴۲۸

۹۔ لہجہ میں نسائیت کی وجہ یہ ہے کہ لکھنؤی معاشرت میں بازاری عورتوں کا رؤسا کے یہاں بڑا دخل ہو گیا تھا (راقم)

۱۰۔ سری رام' لالہ۔ "خم خانۂ جاوید" جلد دوم۔ مطبوعہ امپیریل بک ڈپو دہلی۔ (۱۹۱۱ء) ص ۳۲۳

۱۱۔ سری رام' لالہ۔ "خم خانۂ جاوید" جلد دوم۔ ص ۱۵۲

۱۲۔ سری رام لالہ۔ "خم خانۂ جاوید" جلد دوم۔ ص ۳۲۳-۳۲۴

۱۳۔ سعادت علی صدیقی۔ "نقوش زنداں" مشمولہ "ادبی جائزے" مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ (۱۹۷۵ء) ص ۱۳۱۔ مہر' غلام رسول۔ "غالب" مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس لاہور (۱۹۳۶ء) ص ۱۳۸۔

غالب کے حبسیہ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم
غم دل پردہ دری کرد' فغاں ساز کنم

۱۴۔ محمد نجم الغنی' مولف "تاریخ اودھ" نے انتزاع سلطنت اودھ کی تاریخ ۲۹ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ (مطابق ۷ فروری ۱۸۵۶ء) لکھی ہے لیکن واجد علی شاہ کے اپنے بیان کے مطابق یہ سانحہ ۲۷ جمادی الاول ۱۲۷۱ھ کو پیش آیا۔ مثنوی "حزنِ اختر" کے یہ اشعار توجہ طلب ہیں۔

کر اب میراں جی کا مہینہ رقم
یہ جس میں ہوا حکم تھا یہ علم
دلا بست و ہفتم تھی اس ماہ کی
چھٹی سلطنت جس میں مجھ شاہ کی
اکہتر تھے سن بارہ سو پر زیاد
تو میری زباں سے رکھ اب اس کو یاد

("تاریخ اودھ" جلد پنجم مصنفہ محمد نجم الغنی۔ ص ۲۶۵۔مثنوی "حزن اختر" مصنفہ واجد علی شاہ اختر مطبوعہ دائرہ ادبیہ لکھنؤ (۱۹۲۳ء) ص ۳۸)

۱۵۔ محمد نجم الغنی' مولوی۔ "تاریخ اودھ" جلد پنجم۔ ص ۲۷۵۔

۱۶۔ مولانا عبدالحلیم شرر اس مثنوی کا سن تصنیف ۱۲۶۶ھ بتاتے ہیں جو درست نہیں۔ انہوں نے غالباً مثنوی کے نام "حزن اختر" کو تاریخی نام تصور کیا ہے جس سے ۱۲۶۶ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں حالانکہ یہ نام تاریخی نہیں۔
(مقدمہ مثنوی "حزن اختر"۔ ص ۷)

۱۷- کمال الدین حیدر، سید۔ "قیصرالتواریخ" جلد دوم۔ مطبع نول کشور لکھنؤ (۱۸۹۶ء) ص ۴۵۲
۱۸- "نوائے ظفر" مرتبہ خلیل الرحمن اعظمی بحوالہ اردو کی جیبیہ شاعری مقالہ غلام حسین اظہر۔ ص ۹۳۔ ۹۴
۱۹- امداد صابری، مولانا۔ "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" مکتبہ شاہراہ دہلی (۱۹۵۹ء) ص ۲۰۰۔ ۲۰۲
۲۰- کوکب دہلوی، تفضل حسین خان۔ "فغان دہلی" مرتبہ نظیر لدھیانوی مطبوعہ اکادمی پنجاب لاہور (۱۹۵۴ء) ص ۱۰
۲۱- شان الحق حقی۔ "نشید حریت" ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی (۱۹۶۴ء) طبع ثانی ص ۵۸
۲۲- گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر۔ "۱۸۵۷ء اور اردو شعراء" مطبوعہ "نگار" دسمبر ۱۹۵۷ء۔ ص ۱۷
۲۳- معین الدین عقیل، ڈاکٹر۔ "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ"۔ انجمن ترقی اردو کراچی (۱۹۷۶ء) ص ۲۱۸
۲۴- خلیل الرحمن اعظمی۔ "نوائے ظفر"۔ ص ۲۶۷
۲۵- بلاقی پرشاد۔ "تذکرۂ عالم" بحوالہ اردو کی جیبیہ شاعری (مقالہ) ص ۶۴
۲۶- طاہر فاروقی، ڈاکٹر۔ "ظفر کا دور آخر" مطبوعہ ادبی دنیا لاہور دور پنجم شمارہ دوم، جون جولائی ۱۹۶۰ء
۲۷- قصیدہ اول کا مطلع ہے۔

لجوی له بجوانحی ابراء
جمد الدموع و ذابت الاحشاء

(سوز دل سے میرے پہلو کی ہڈیوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ آنسو خشک اور اندرونی اعضاء پگھل رہے ہیں)

دوسرے قصیدہ کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

عودی فعودی مریضا داؤ عادی
اشفی علی الحین حتی عاده العادی

(اے محبوبہ واپس آ اور ایک مریض کی عیادت کر جس کا مرض قدیم اور متعدی ہے)

" الثورة الهندیه" (باغی ہندوستان) تصنیف، مولانا فضل حق خیر آبادی، ترجمہ وترتیب عبدالشاہد خان شیروانی، مدینہ پریس بجنور (۱۹۴۷ء) ص ۳۳۵۔ ۳۶۰
۲۸- معین الدین عقیل، ڈاکٹر۔ "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ"۔ ص ۲۱۹
۲۹- محمد ایوب قادری۔ "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ واقعات وشخصیات" مطبوعہ پاک اکیڈمی کراچی (۱۹۷۶ء) ص ۴۵۰۔ ۴۵۱
۳۰- امیر مینائی۔ تذکرہ "انتخاب یادگار" تاج المطابع رام پور (۱۲۹۷ھ) ص ۱۳۸۔
۳۱- محمد ایوب قادری۔ "جزائر انڈمان ونکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات" مقالہ مشمولہ "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ واقعات وشخصیات"۔ ص ۴۵۲
۳۲- تفصیل کے لئے دیکھئے۔ "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" مصنفہ مولانا امداد صابری۔ ص ۲۰۳ تا ۴۰۸
۳۳- رئیس احمد جعفری۔ "واجد علی شاہ اوران کا عہد" مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور (۱۹۶۷ء) بار دوم۔ ص ۴۴۷
۳۴- محمد نجم الغنی، مولانا۔ "تاریخ اودھ" جلد پنجم۔ ص ۲۸۶۔ ۲۸۷
۳۵- حیدر قلی خان، آغا۔ "منیر شکوہ آبادی" (مقالہ ایم اے ۱۹۵۶ء) ص ۸۶۔۸۷
۳۶- حیدر قلی خان، آغا۔ "منیر شکوہ آبادی"۔ ص ۸۳۔ ۸۴
۳۷- اختر، واجد علی شاہ۔ "تاریخ ممتاز" ، مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر، مطبوعہ اردو مرکز لاہور (۱۹۵۲ء) ص ۵۹
۳۸- "تاریخ ممتاز"۔ ص ۴۴
۳۹- "تاریخ ممتاز"۔ ص ۲۰
۴۰- "تاریخ ممتاز"۔ ص ۴۰
۴۱- "تاریخ ممتاز"۔ ص ۳۴
۴۲- "تاریخ ممتاز"۔ ص ۵۵
۴۳- "تاریخ ممتاز"۔ ص ۳۶۔ ۳۷۔ ۵۱۔ حقی، شان الحق۔ "نشید حریت" ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی (۱۹۵۷ء) ص ۷۸
۴۴- اختر، واجد علی شاہ۔ "ملک اختر" (مجموعہ کلام) مطبع سلطانی کلکتہ (۱۲۹۶ھ) ص ۱۰۹، ۱۱۰

۴۵۔ اختر، واجد علی شاہ۔ مثنوی "حزنِ اختر" مطبوعہ دائرہ ادبیہ لکھنؤ (۱۹۲۲ء) ص ۳۰

۴۶۔ اختر، واجد علی شاہ۔ مثنوی "حزنِ اختر"۔ ص ۳۶

۴۷۔ اختر، واجد علی شاہ۔ مثنوی "حزنِ اختر"۔ ص ۳۲۔ ۳۳

۴۸۔ اختر، واجد علی شاہ۔ مثنوی "حزنِ اختر"۔ ص ۴۲۔ ۴۳

۴۹۔ اختر، واجد علی شاہ۔ مثنوی "حزنِ اختر"۔ ص ۷۷۔ ۷۸

۵۰۔ یونانی دیومالا کا ایک معروف کردار جس نے چکنی مٹی سے انسان کا پتلا بنایا۔ اولمپس سے آگ چرا کر لایا اور انسان کو فنون و ہنر سکھائے جس کی پاداش میں زیوس (Zues) نے اس کو کوہ قاف کی چٹان سے جکڑ دیا۔

(Webester New International Dictionery of English Language London (1924) -P 1716)

۵۱۔ محمد نجم الغنی رام پوری۔ "تاریخ اودھ" جلد پنجم۔ ص ۲۷۳ تا ۲۷۶

۵۲۔ کمال الدین حیدر، سید۔ "قیصر التواریخ" جلد دوم۔ ص ۴۵۳

۵۳۔ راشد الخیری۔ "نوبت پنج روزہ"۔ راشد الخیری اکیڈمی کراچی، (۱۹۶۹ء) ص ۱۳۸، ۱۳۹

۵۴۔ پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں
گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
("کلیات منیر" - قطعہ تاریخ مصائب قید و حالات زنداں۔ ص ۴۹۶)

۵۵۔ منیر نے انڈمان کے اصل باشندوں کو "جنگلی" کہا ہے۔ یہ خونخوار ختم اور مکار لوگ تھے جس کی تصدیق "گزیٹیر آف دی ورلڈ" کے مرتب کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"The aborigines are an anamalous race of the most degraded and repulsive description. They are fierce, cunning and vindictive and present in their features and general aspect the appearance of degenerate class of Negroes. They are perfectly black and rarely exceed 5 ft in height. Their heads are large, their shoulders high, their bodies protuberant, and their limbs disproportionately small. The only covering of their persons consists of mud in which they keep themselves constantly encased as a protection from the noxious insects with which the islands are infested."

(" A Gazetteer of the World" - Vol I- Published by Fullarton & Co., London-P 247 ")

۵۶۔ فضل حق خیر آبادی۔ " الثورة الهندیہ" (باغی ہندوستان)۔ ص ۴۲۱ تا ۴۲۳

۵۷۔ علی جواد زیدی، سید۔ "قصیدہ نگاران اترپردیش" مطبوعہ اترپردیش اکادمی، لکھنؤ (۱۹۷۸ء) ص ۶۰

۵۸۔ اعجاز الرحمن۔ "بہادر شاہ ظفر" (مقالہ ایم اے۔ ۱۹۵۷ء) ص ۱۰-۱۱

۵۹۔ فیض، فیض احمد۔ "زنداں نامہ" مطبوعہ مکتبہ کارواں لاہور (۱۹۵۶ء) ص ۱۱۰۔ ■

کتابیات

قلمی وغیر مطبوعہ

۱۔ اعجاز الرحمٰن۔ بہادر شاہ ظفر۔ مقالہ ایم اے، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۔ ۱۹۵۷ء

۲۔ توصیف تبسم۔ منیر شکوہ آبادی، احوال و آثار۔ مملوکہ راقم مقالہ

۳۔ حیدر قلی خان، آغا۔ منیر شکوہ آبادی۔ مقالہ ایم اے' پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ۱۹۵۶ء

۴۔ غلام حسین۔ اردو کی حبسیہ شاعری۔ مقالہ ایم اے' پنجاب یونیورسٹی لاہور

۵۔ منیر شکوہ آبادی، سید اسمٰعیل حسین۔ سنانِ دل خراش۔ مخزونہ ٹیگور لائبریری، لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

۶۔ مہر، پروفیسر علی سجاد۔ کچھ یادیں، کچھ باتیں (یادداشتیں)۔ مملوکہ راقم

مطبوعہ

۱۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ اردو مرکز لاہور (اشاعت دوم) ۱۹۶۷ء

۲۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر۔ شہابی اکبر آبادی، مفتی محمد انتظام اللہ۔ عبدالسلام، مولانا۔
لکھنؤ کی آخری شمع۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ (س ن)

۳۔ اختر، واجد علی شاہ۔ تاریخ ممتاز مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر۔ اردو مرکز لاہور۔ ۱۹۵۲ء

۴۔ اختر، واجد علی شاہ۔ حزنِ اختر (مثنوی)۔ دائرہ ادبیہ لکھنؤ۔ ۱۹۲۲ء

۵۔ اختر، واجد علی شاہ۔ ملک اختر (مجموعہ کلام)۔ مطبع سلطانی کلکتہ۔ ۱۲۹۶ھ

۶۔ اشتیاق حسین قریشی۔ برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ۔ کراچی یونیورسٹی کراچی۔ ۱۹۶۷ء

۷۔ امداد صابری، مولانا۔ ۱۸۵۷ء کے غدار شعراء۔ یونین پریس دہلی۔ ۱۹۶۰ء

۸۔ امداد صابری، مولانا۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء۔ مکتبہ شاہراہ دہلی۔ ۱۹۵۹ء

۹۔ امداد صابری، مولانا۔ تاریخ جرم وسزا، جلد دوم۔ بمبئی چوب پریس دہلی۔ ۱۹۴۵ء

۱۰۔ امیر مینائی، منشی امیر احمد۔ تذکرہ انتخاب یادگار۔ تاج المطابع رام پور۔ ۱۲۹۷ھ

۱۱۔ تسلیم، منشی امیر اللہ۔ تاریخ بدیع ۔ مطبع افتخار عالم رام پور ۔ ۱۳۱۲ھ

۱۲۔ ثابت لکھنوی، افضل حسین۔ دربار حسین موسوم بہ چراغ مجالس۔ مطبع اثنا عشری دہلی۔ ۱۳۳۸ھ

۱۳۔ خواجہ احمد فاروقی۔ کلاسیکی ادب۔ آزاد کتاب گھر دہلی۔ ۱۹۵۳ء

۱۴۔ دتاسی، گارساں۔ خطبات۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۔ ۱۹۳۵ء

۱۵۔ ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر۔ دبستان دبیر ۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ ۱۹۶۶ء

۱۶۔ راشد الخیری' مولانا۔ نوبت پنج روزہ۔ راشد الخیری اکیڈمی کراچی۔ ۱۹۶۹ء

۱۷۔ رئیس احمد جعفری۔ واجد علی شاہ اور ان کا عہد۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ ۱۹۶۷ء

۱۸۔ سحر' ڈاکٹر ابو محمد۔ اردو میں قصیدہ نگاری۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ ۱۹۶۵ء

۱۹۔ سر سید احمد خاں۔ رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند۔ یونیورسٹی پبلشرز علی گڑھ۔ ۱۹۵۸ء

۲۰۔ سرورؔ نواب اعظم الدولہ، میر محمد خاں بہادر۔ عمدۂ منتخبہ۔ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔
دہلی یونیورسٹی دہلی۔ اشاعت اول۔ ۱۹۶۱ء
۲۱۔ سری رام، لالہ۔ خم خانہ جاوید، جلد دوم۔ امپریل بک ڈپو دہلی۔ ۱۹۱۱ء
۲۲۔ سری رام، لالہ۔ خم خانہ جاوید، جلد سوم۔ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی، بار اول۔ ۱۹۱۷ء
۲۳۔ سعادت علی صدیقی۔ ادبی جائزے۔ نامی پریس لکھنؤ۔ ۱۹۷۵ء
۲۴۔ سکسینہ، رام بابو۔ تاریخ ادب اردو۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ اشاعت سوم۔
۲۵۔ سیّد احمد دہلوی۔ فرہنگ آصفیہ، جلد دوم۔ مکتبہ حسن سہیل لاہور، طبع سوم (پاکستانی ایڈیشن)
۲۶۔ شان الحق حقی۔ نشید حریت۔ ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی۔ ۱۹۶۴ء
۲۷۔ شررؔ عبدالحلیم۔ گزشتہ لکھنؤ۔ گیلانی الیکٹرک پریس لاہور۔ (س ن)
۲۸۔ شوق، حافظ احمد علی خاں۔ تذکرہ کاملانِ رام پور۔ ہمدرد پریس دہلی۔ ۱۹۲۹ء
۲۹۔ شیفتہ، نواب مصطفٰے خاں۔ گلشنِ بے خار، ترجمہ احسان الحق فاروقی۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچ
۳۰۔ عبداللہ عاشق، مولوی۔ بہارستان اودھ (ترجمہ بوستانِ اودھ)۔ منبع فیض پریس دہلی۔ (س ن)
۳۱۔ علی جواد زیدی۔ قصیدہ نگارانِ اُتر پردیش۔ اردو اکادمی لکھنؤ۔ ۱۹۷۸ء
۳۲۔ علی حسن خاں۔ نور الحسن خاں۔ تذکرہ بزم سخن مرتبہ عطا کاکوی۔ آرٹ پریس پٹنہ۔ ۱۹۶۸ء
۳۳۔ غالب، اسد اللہ خاں۔ اردوئے معلّٰی۔ اکمل المطابع دہلی، بار اول۔ ۱۲۸۵ھ
۳۴۔ غالب، اسد اللہ خاں۔ دیوان غالب اردو مرتبہ امتیاز علی عرشی۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔ ۱۹۵۸ء
۳۵۔ فضل حق خیر آبادی، مولانا۔ الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) ترجمہ و ترتیب عبدالشاہد خان
شیروانی۔ مدینہ پریس بجنور۔ ۱۹۴۷ء
۳۶۔ فیضؔ، فیض احمد۔ زنداں نامہ۔ مکتبہ کارواں لاہور۔ ۱۹۵۶ء
۳۷۔ قادریؔ، حامد حسن۔ تاریخ و تنقید۔ قادری اکادمی کراچی۔ ۱۹۶۶ء
۳۸۔ کشفی، ابوالخیر۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ ادبی پبلی کیشنز کراچی۔ ۱۹۷۵ء
۳۹۔ کمال الدین حیدرؔ، سید۔ قیصر التواریخ، جلد دوم۔ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ۔ ۱۸۹۶ء
۴۰۔ کوکب دہلوی، تفضل حسین خاں۔ فغانِ دہلی مرتبہ نظیر لدھیانوی۔ اکادمی پنجاب لاہور۔ ۱۹۵۴ء
۴۱۔ کیفی چریاکوٹیؔ، محمد مبین۔ جواہر سخن، جلد چہارم۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔ ۱۹۳۹ء
۴۲۔ محسن لکھنوی، سید۔ تذکرہ سراپا سخن۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ ۱۲۷۷ھ
۴۳۔ محمد احد علی۔ شباب لکھنؤ۔ الناظر پریس لکھنؤ۔ ۱۹۱۲ء
۴۴۔ محمد ایوب قادری۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء: واقعات و شخصیات۔ پاک اکیڈمی کراچی۔ ۱۹۷۶ء
۴۵۔ محمد جعفر تھانیسری۔ کالا پانی۔ شیر اکیڈمی لاہور۔ ۱۹۷۶ء
۴۶۔ محمد شفیع، میاں۔ ۱۸۵۷ء: پہلی جنگ آزادی۔ مکتبہ جدید لاہور۔ بار دوم۔ ۱۹۵۸ء

۴۷۔ محمد نجم الغنی رام پوری، مولوی۔ تاریخ اودھ، جلد سوم۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ ۱۹۱۹ء
۴۸۔ محمد نجم الغنی رام پوری، مولوی۔ تاریخ اودھ، جلد پنجم۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ ۱۹۱۹ء
۴۹۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر۔ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ۔ انجمن ترقی اردو کراچی۔ ۱۹۷۶ء
۵۰۔ منیر شکوہ آبادی، سید اسمٰعیل حسین۔ تنویر الاشعار (دیوان دوم)۔ مطبع سعیدی رام پور۔ ۱۳۲۵ھ
۵۱۔ منیر شکوہ آبادی، سید اسمٰعیل حسین۔ کلیات منیر۔ مطبع نامی گرامی ثمر ہند لکھنؤ۔ ۱۲۹۶ھ
۵۲۔ منیر شکوہ آبادی، سید اسمٰعیل حسین۔ مثنوی معراج المضامین (بار دوم)۔ مطبع گلشن باقری لکھنؤ۔ ۱۳۱۲ھ
۵۳۔ منیر شکوہ آبادی، سید اسمٰعیل حسین۔ منتخب العالم (دیوانِ اول)۔ مطبع سعیدی رام پور۔ ۱۳۲۳ھ
۵۴۔ منیر شکوہ آبادی، سید اسمٰعیل حسین۔ نظم منیر (دیوان سوم)۔ مطبع سعیدی رام پور ۱۳۲۳ھ
۵۵۔ مہر، مولانا غلام رسول۔ غالب۔ مسلم پرنٹنگ پریس لاہور۔ ۱۹۳۶ء
۵۶۔ نادم سیتاپوری۔ غالبِ نام آورم۔ سرفراز پریس لکھنؤ۔ ۱۹۶۱ء
۵۷۔ ناصر، سعادت خاں۔ خوش معرکہ زیبا (جلد دوم) مرتبہ مشفق خواجہ۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۷۲ء
۵۸۔ ناطق لکھنوی، حکیم۔ نظمِ اردو۔ ظفر المطابع لکھنؤ، بار دوم۔ ۱۹۴۱ء
۵۹۔ ناظم، نواب یوسف علی خاں۔ دیوانِ ناظم۔ مطبع حسنی محمد خان رام پور۔ ۱۲۷۸ھ
۶۰۔ نجم آفندی، تجمل حسین۔ اسرار و افکار۔ ادارہ قدر ادب حیدر آباد (دکن)۔ ۱۹۷۱ء
۶۱۔ نساخ، عبد الغفور۔ تذکرہ سخن شعراء مرتبہ عطا کاکوی۔ آرٹ پریس پٹنہ۔ ۱۹۷۲ء
۶۲۔ نعیم احمد، ڈاکٹر۔ شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ۔ ادبی اکادمی علی گڑھ۔ ۱۹۷۹ء
۶۳۔ نواب، نواب کلب علی خاں۔ دستنبو خاقانی (دیوان دوم)۔ مطبع تاج المطابع رام پور۔ ۱۲۹۵ھ
۶۴۔ نور الحسن خاں۔ تذکرہ نگارستان سخن مرتبہ عطا کاکوی۔ آرٹ پریس پٹنہ۔ ۱۳۸۸ھ
۶۵۔ یار علی جان، میر۔ مسدس تہنیت جشن بے نظیر مرتبہ محمد خاں اثر رام پوری۔ اسٹیٹ پریس رام پور۔ ۱۹۵۰ء
۶۶۔ یاسمین، ڈاکٹر زہرہ بیگم۔ منیر شکوہ آبادی، سوانح حیات و کلام۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ (س ن)
۶۷۔ جامع ترمذی، جلد دوم۔ فرید بک سٹال لاہور۔ بار اوّل۔ ۱۴۰۴ھ

مقالات

۱۔ اثر رام پوری، محمد علی خاں۔ منیر شکوہ آبادی۔ ''ہماری زبان'' علی گڑھ۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۵۶ء
۲۔ ادیب، ڈاکٹر لطیف حسین۔ روہیلوں کے دور میں اردو شاعری کا فروغ۔ مجلّہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔ اگست ۱۹۶۰ء
۳۔ افسر صدیقی امروہوی۔ فہرست شعرائے سلسلہ دبیر۔ سہ ماہی ''اردو'' کراچی۔ جلد ۵۲، شمارہ ۲۔ ۱۹۷۶ء
۴۔ بدر، حسن افضل۔ منشی منیر شکوہ آبادی۔ ''اردوئے معلّٰی'' علی گڑھ۔ اپریل ۱۹۰۵ء
۵۔ تاثیر اناوی، لالہ مادھو رام۔ منیر شکوہ آبادی۔ ''اردوئے معلّٰی'' علی گڑھ۔ فروری ۱۹۰۵ء
۶۔ حامی، بشن نرائن۔ منیر شکوہ آبادی۔ پندرہ روزہ ''آجکل'' دہلی۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۹ء

۷۔ دلدار نصری۔ منیر شکوہ آبادی اور رام پور۔ روز نامہ ''ناظم'' رام پور۔ ۲۶ جنوری ۱۹۸۳ء
۸۔ راز یزدانی، منشی احمد ولی خاں۔ اصلاحِ زبانِ اردو اور مصاحب منزل رام پور۔ ''آجکل'' دہلی۔ جولائی ۱۹۵۷ء
۹۔ ضیاء احمد بدایونی، پروفیسر۔ منیر شکوہ آبادی۔ ''علی گڑھ میگزین''۔ شمارہ: مئی، جون ۱۹۲۸ء
۱۰۔ طاہر فاروقی، ڈاکٹر۔ ظفر کا دورِ آخر۔ ''ادبی دنیا'' لاہور۔ جون، جولائی ۱۹۶۰ء
۱۱۔ فائق رام پوری، مولانا کلب علی خاں۔ یادِ رفتگاں، رام پور کا ادبی مرکز۔ ماہنامہ ''نگار'' لکھنؤ مارچ ۱۹۵۳ء
۱۲۔ فضل حسین اٹاوی۔ منیر شکوہ آبادی۔ مخزن لاہور۔ جون ۱۹۰۳ء
۱۳۔ محمد طفیل۔ مکاتیب نمبر، جلد دوم۔ ''نقوش'' لاہور۔ نومبر ۱۹۵۷ء
۱۴۔ محمد عمر نور الٰہی۔ مثنوی حجاب زناں۔ سہ ماہی ''اردو'' دہلی۔ اپریل ۱۹۴۶ء
۱۵۔ معراج دھولپوری، قاضی۔ میر محمد اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی۔ ''ہماری زبان'' علی گڑھ۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۹ء
۱۶۔ نارنگ، گوپی چند۔ ۱۸۵۷ء اور اردو شعراء۔ ماہنامہ ''نگار'' لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۵۷ء

اخبارات و رسائل: ۱۔ ہفت روزہ ''کوہ نور'' لاہور۔ ۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء

۲۔ ہفت روزہ ''کوہ نور'' لاہور۔ ۷ نومبر ۱۸۶۰ء ۳۔ ہفت روزہ ''تنقید'' بمبئی۔ (منیر شکوہ آبادی نمبر)

مراسلات: مکتوب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی بنام اسعد بدایونی۔ مورخہ ۲۵ جون ۱۹۸۰ء

انگریزی مطبوعات

1. Asoka, Mehta. 1857- The Great Rebellion.(Bombay)- 1946
2. Aspinnal, A. Cornwallis in Bengal.(Manchester) - 1931
3. Hunter, W.W. Our Indian Muslimans (Calcutta)- 1945
4. Meer Hassan Ali, Mrs. Observations on the Muslimans of India. (Oxford London)-1978
   Vol. 5. Russell, Sir W.H. My Diary in India in the Year 1858-59 II-(London)- 1860.
6. Sen, Surrendra Nath. Eighteen Fifty Seven.(Delhi) - 1957
7. Temple Rechard. India in 1880 (London) 1880 .
8. A Gazetteer of the World - Vol-I (Fullerton London)
9. District Gazetteer of the U.P.
   (i) Banda (ii) Farrukhabad (iii) Rampur State
10. Imperial Gazetteer of India.
   Vol. I (London) 1881 Vol. V (London) 1908
11. Pears Cyclopaedia (Gazetteer of the World) London 1923.
12. Webester New Intl. Dictionery of English Language. (London) 1924.
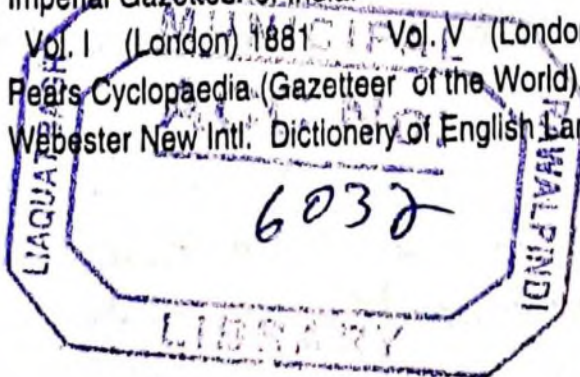
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا مُجاہد شاعر
(میر محمد اسمٰعیل حسینؒ منیرؔ شکوہ آبادیؒ)

میر محمد اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی (۱۸۱۸ء-۱۸۸۰ء) کا شمار انیسویں صدی کے ان باکمال شاعروں میں ہوتا ہے جو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں نہ صرف عملی طور پر شریک رہے بلکہ اس ''جرمِ بغاوت'' کی سزا کے طور پر ان کو کالے پانی کی اذیتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ انگریزوں نے اس سزا کا سبب ایک طوائف نواب جان کے قتل کو قرار دیا۔ یہ دراصل اسی کردارکشی کا حصہ تھا جو انہوں نے ہمارے حریت پرستوں کے سلسلہ میں روا رکھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ بعض تذکرہ نگار اصل حقائق جانے بغیر اسی رو میں بہہ گئے ہیں۔ یہ مقالہ داخلی اور خارجی شہادتوں کی روشنی میں اس داغ کو دھونے کی ایک حقیری کوشش ہے۔ مقالہ کے دوسرے حصہ میں منیرؔ کی حبسیہ شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ انہوں نے انڈمان میں جو کچھ لکھا وہ معروضی حبسیہ شاعری کے زمرہ میں آتا ہے جو ان کا امتیازی وصف ہے۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد

راولپنڈی۔لاہور۔ملتان۔فیصل آباد۔واہ کینٹ۔بہاولپور۔کراچی۔حیدرآباد۔سکھر۔نواب شاہ
لاڑکانہ۔جام شورو۔جیکب آباد۔پشاور۔ایبٹ آباد۔کوہاٹ۔ڈی آئی خان۔بنوں۔کوئٹہ

قیمت: 130 روپے